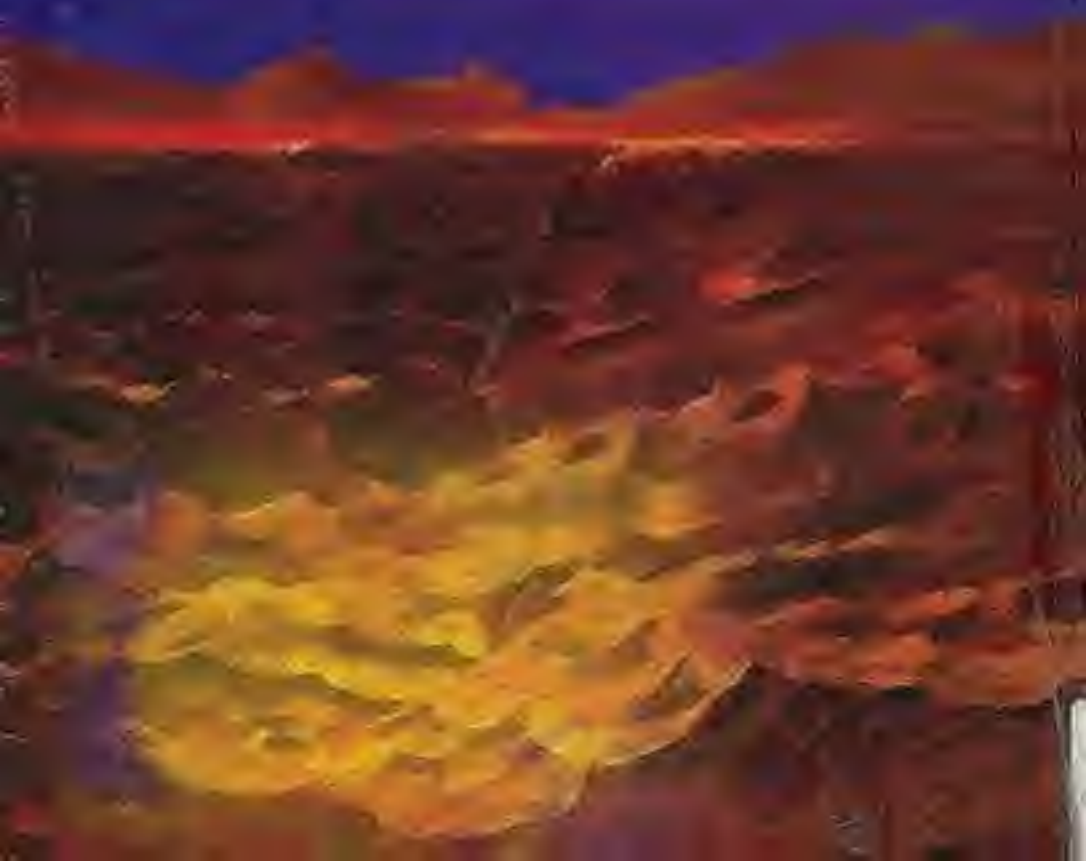


اے حمید

پیلا اداس چاند



پہلا اداس چاند

1905

1905

1905

1905

ایم جید

1905

1905

1905

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

(1)

دسمبر کی ایک انتہائی سرد اور کمر میں ڈوبی ہوئی رات تھی۔ میکوڑ روڈ کے ہوٹلوں کے دروازے بند تھے۔ اور اندر بیٹھے اکا وکالوگ گرم گرم چائے پی رہے تھے۔ سڑک پر دور تک دھند پھیلی ہوئی تھی ' دو روز پہلے کی بارش نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ لکشمی کے چوک میں کہیں کہیں کسی پنڈاڑی کی دکان کھلی تھی۔ کبیر کو نیز روڈ کی جانب سے رائل پارک کے محلے میں داخل ہوا۔ اس کا قد درمیانہ، جسم دبلا پتلا اور سر کے بال سیدھے تھے جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کوئی پینتیس برس کی عمر ہوگی۔ آنکھیں سیاہ تھیں، اور گہرے فکر کے انداز میں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر سے ایک قسم کی خوش فکری اور بے نیازی ہوئی تھی۔ ماتھا چوڑا تھا۔ رنگ گندی اور ٹاک کے ننھے فراخ تھے۔ جو اس کی کشادہ دلی اور جذباتی طبیعت کی علامت تھے۔ اس نے خیالے سے رنگ کا ایک لمبا اوڑھن کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کے کالراٹھے ہوئے تھے۔ کندھے پر ایک جگہ سے بلیہ اوٹھ گیا تھا۔ پاؤں میں جوتے تھے جن پر گرد پڑا تھا۔ گرم پتلون کے پانچپے پر پان کی پیک کا داغ پڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ سر پر سواری رنگ کی ادنی ٹوپی تھی۔ اس کے ارد گرد رائل پارک کی اونچی اونچی عمارتوں میں گہرا سکوت اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ دھند میں یہ عمارتیں سردی کی وجہ سے سکڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کس جگہ روشندان کی ذرہ آنکھ میں ہے روشنی جھانک رہی تھی۔ گلیوں کی ساری دکانیں بند تھیں۔ لوگ اپنے اپنے ٹکرات، غم و اندوہ اور جمل سازبوں کو ساتھ لئے گرم لفافوں میں دبکے سو رہے تھے۔ اس محلے میں ایک جگہ کبیر بھی رہتا تھا۔ اس نے ایک عمارت میں کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اس کا ایک دوست احسان رہتا تھا۔ جو ریٹوے میں ٹھہر گیا تھا۔ کبیر جب ایک گلی کا موڑ گھوم کر ایک مکان کے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اچانک ٹھیکٹ گیا۔ اس کے دوست احسان کے کمرے کی جی جی جل رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ باتیں کرنے والے کا لہجہ قد بے تلخ تھا، کبیر

نے بندہ دروازے کے ساتھ کان لگا کر سنا وہ کوئی احسان سے کہ رہا تھا۔
 "اس میں کوئی شک نہیں کہ کبیر ضابط ایک عرصے سے بیمار ہیں۔ لیکن صاحب میں کیا کروں؟ میں اپنے بچوں کو کمال سے کھاؤں؟ اگر اسی طرح میں لوگوں کو قرض دے کر پیچھے بیمار ہوں تو ہائے میرا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟"

انہیں اس سے کہ رہا تھا۔

"مگر صاحب آپ بھی سچے ہیں اور کبیر بھی سچا ہے۔ آپ کو اپنا قرض واپس نہ ملا تو آپ اپنے بچوں کو کمال سے کھائیں گے؟ اور کبیر کو جب تک کوئی نہ ملے کہ وہ آپ کے روپے انہیں سے واپس نہیں کر سکتا۔"

"ہائیں صاحب میں نے ان کی کوئی کامیابی نہیں لے کر کہا آج تو میں اپنا روپہ لے کر ہی رہا ہوں۔ میں نے ان کا وہ مال ہو سکتا تھا جو انہوں نے میرا سے ایک پالی بھی ادا نہیں کی۔ میں تو یہاں دھرم دار کر بیٹا ہوں۔ اب یہ کبیر نے وہ پ کر کھسے سیکڑے اور بیگلی بی بی کر کان پیٹ وہاں سے واپس ہو گیا۔ جلدی جلدی جلی میں نے لگا اور کو تیز دوا پڑا۔ پہلی پالی کی طرف سے چلا گیا ہے۔ کہ وہ اپنے کمرے میں واپس نہیں جا سکا تھا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ نہیں تھا کہ رات بلیش پر بھی پٹ فارم پر کھڑی گاڑی کے ذریعے یا پھر چل کر سڑک کی جانب۔ بلیش پر رات بھر بکرا کبیر کے لئے کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ رات بھر پارک ڈاؤن کمرے میں آئے تھے۔ پھر اس نے کئی راتیں بلیش پر بڑی جھینڈ ایک بار دو رات کو پٹ فارم ہسپتال پر کھڑی خالی گاڑی کے ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی کھوڑ کی طرف بھاگی جا رہی تھی اس نے سوچا۔ چلو دریا کھوڑ کی سیر ہو جائے۔ چنانچہ دن بھر اس نے ٹھٹھ کی گاڑی کی سیر کی اور آگے روز رات کو واپس لاہور آیا۔

ادھر بھی وہ بلیش پر ہونے کے لئے ایٹ روزہ پڑے ہوئے تھا۔ لیکن روزہ کی طرف آگیا۔ سردی ہوئے۔ غصہ کی پڑ رہی تھی۔ سڑکیں بالکل سناں تھیں۔ کھجور کے دروازے بند تھے۔ باغوں میں اوس گر رہی تھی۔ کھجوریں اور دھندلوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ کبیر سر جھکا کر کھسے سکوڑے۔ دونوں ہاتھ اور گت کی جیبوں میں دیکھے فٹ ہاتھ پڑ چپ چاپ چلا رہا تھا۔ گھر سوار بیابوں کا ایک دستہ گت کرتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ ایک سپاہی نے غور سے کبیر کی طرف دیکھا اور پھر۔

آگے چل دیا۔ بلیش کی تمام جہان چل رہی تھی۔ پہلے اور دو ہڑتے ڈرتے کا آمالہ دیران ویران تھا۔ لیکن تیسرے درجے کے اعلیٰ میں رونق تھی۔ لوگ۔ بچوں پر انور زمین پر کھسے حصے لاف اور بے یا سو رہے تھے اور یا بیٹے چھٹی رہے تھے۔ اور ہاتھیں کر رہے تھے۔ پانچ کے شیل پر یکہ لوگ کھڑے گرم گرم کھانے لپٹی رہے تھے۔ کبیر یہاں سے گزر کر پٹ فارم پر آگیا۔ یہاں بھی چاروں طرف ویرانی تھی۔ ایک ایجنٹ شیفٹ کرنا شروع کیا۔ لائیں پر نئے گزر گیا۔ پچ پر لیٹے ہوئے ایک آدمی نے لاف میں سے چند پائے نکال کر دیکھا اور پھر سر لاف کے اندر گر گیا۔

وہ اتفاق سے پٹ فارم پر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ پچ سارے تھے۔ سارے لڑکے لڑکے ہوئے تھے۔ پچ پر کوئی گاڑی لاف کھی نہ کسی انسان کو اپنی آغوش میں روپے پڑا تھا۔ کبیر نے وہ پ کر کھسے سیکڑے اور بیگلی بی بی کر کان پیٹ وہاں سے واپس ہو گیا۔ صبح ایک پالی بھی ادا نہیں کی۔ میں تو یہاں دھرم دار کر بیٹا ہوں۔ اب یہ کبیر نے وہ پ کر کھسے سیکڑے اور بیگلی بی بی کر کان پیٹ وہاں سے واپس ہو گیا۔ جلدی جلدی جلی میں نے لگا اور کو تیز دوا پڑا۔ پہلی پالی کی طرف سے چلا گیا ہے۔ کہ وہ اپنے کمرے میں واپس نہیں جا سکا تھا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ نہیں تھا کہ رات بلیش پر بھی پٹ فارم پر کھڑی گاڑی کے ذریعے یا پھر چل کر سڑک کی جانب۔ بلیش پر رات بھر بکرا کبیر کے لئے کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ رات بھر پارک ڈاؤن کمرے میں آئے تھے۔ پھر اس نے کئی راتیں بلیش پر بڑی جھینڈ ایک بار دو رات کو پٹ فارم ہسپتال پر کھڑی خالی گاڑی کے ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی کھوڑ کی طرف بھاگی جا رہی تھی اس نے سوچا۔ چلو دریا کھوڑ کی سیر ہو جائے۔ چنانچہ دن بھر اس نے ٹھٹھ کی گاڑی کی سیر کی اور آگے روز رات کو واپس لاہور آیا۔

ادھر بھی وہ بلیش پر ہونے کے لئے ایٹ روزہ پڑے ہوئے تھا۔ لیکن روزہ کی طرف آگیا۔ سردی ہوئے۔ غصہ کی پڑ رہی تھی۔ سڑکیں بالکل سناں تھیں۔ کھجور کے دروازے بند تھے۔ باغوں میں اوس گر رہی تھی۔ کھجوریں اور دھندلوں پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ کبیر سر جھکا کر کھسے سکوڑے۔ دونوں ہاتھ اور گت کی جیبوں میں دیکھے فٹ ہاتھ پڑ چپ چاپ چلا رہا تھا۔ گھر سوار بیابوں کا ایک دستہ گت کرتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ ایک سپاہی نے غور سے کبیر کی طرف دیکھا اور پھر۔

"ہو تم ایک سال کے بند آئے ہو۔ تمہاری باتیں پہلے بھی میری سمجھ میں آتی تھیں اور نہ اب میں انہیں سمجھتا ہوں۔"

کیر نے مسکرا کر کہا۔
"میں اگر ایک ہزار سال بعد بھی آیا اور تم میں موجود ہوئے تو تمہارا کیا جواب ہو گا؟"

چوکیدار کیر کا منہ دیکھتا رہا اور وہ دروازہ کھول کر باہر پیٹ فارم پر نکل آیا۔ پیٹ فارم سردی میں غصہ پڑا تھا۔ لگا بھڑکا اور برسات کی سیل کی طرح۔ ایک قلی پارسل انہیں میں سے ٹوکر لیا۔ نکل کر دیر می پر لا رہا تھا جب اس نے ٹوکر لیا لاد لیں تو دیر می کو لے کر دوسرے پیٹ فارم کی طرف چل پڑا اور وحش میں غائب ہوا گیا۔ کیر نے خالی پیٹ فارم کے دو ایک پتھر لگائے پھر ایک بند بک شال کے چھوٹے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اور سگریٹ پینے لگا۔ غیر اسے باطل نہیں آ رہی تھی۔ ہاں سردی ضرور لگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بند کمرے میں اکیسویں کے پاس بیٹھ جائے اور ساری رات گزار دے۔ کیر کو رات کو سونا پتھر نہیں تھا وہ اکثر راتوں کو جاگتا اور دن کو سونا کرتا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی کے پاس سہان بن کر اترے اور جانتے ہوئے ان کی کوئی چیز اٹھا کر لے جائے۔ رات کو نہایت چمڑا کر وہ نہیں سو سکتا تھا۔ جب تک رات ہاتھی وہ کو شش کرنا کہ خود بھی جاگتا رہے لیکن اکثر اسے نیند آ جاتی اور وہ سو جاتا۔ پھر صبح اندر جیسے ہی اٹھ کر باہر نکل آتا اور قلی کوہوں کے باہر والے باغوں اور کھیتوں میں پتھر لگایا کرتا۔ اسے دو سوواں کو سونا ہوا دیکھنے میں بڑا مزہ آتا۔ جس طرح ٹیک آدمی کسی کو بڑا ب میں جھکا دیکھ کر جہت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح کیر دو سوواں کو سونا دیکھ کر جہت پکڑا کرتا۔ اسے یہ محسوس کر کے غر مایہ محسوس ہوتا کہ وہ بچہ کے ساتھ جاگ رہا ہے۔ بچہ جو بھی نہیں سوتی۔ جس کا ہاتھ اسے سب سے بڑا آرام ہے۔

اس کے باوجود کیر تمام انسانی کمزوریوں کا مجموعہ تھا۔ جب اس پر نیند چلے کرتی تو وہ اس کا وارنہ بچا سکتا اور بے سیدھ ہو کر پڑ جاتا۔ لیکن دن آخری دم تک اس کا مقابلہ کرتا اور صرف اس وقت شکست قبول کرتا جب کوئی چارہ کار نہ رہتا۔ نیند کا تو وہ مقابلہ کر سکتا تھا۔ مگر سردی کا وہ اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقابلے کے لئے گرم کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اور کیر کے پاس صرف ایک چمڑی آستینوں کا سونپڑا اور

ایک اور کوٹ تھا اور کوٹ کندھے پر سے اوجھڑا ہوا تھا۔ یہ کوٹ کیر نے دو سال ہوئے لٹھا بازار سے خریدا تھا۔ یہ کوٹ صرف ایک پار ڈھلایا گیا تھا۔ اس کے کنارے اور کٹوں پر تھوڑا تھوڑا میل جم رہا تھا۔ یہ کوٹ کیر کو لوگوں کی خیر نظروں سے تو ضرور بچاتا تھا۔ مگر سردی سے اتنا زیادہ محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ خاص طور پر دسمبر کے آخری اور جنوری کے شروع کے دنوں میں جب پار میں بھی ہو جایا کرتیں کیر کو راتوں کی آوارہ گردی کرتے ہوئے اس کوٹ میں سردی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس وقت بھی کیر کو تھوڑی تھوڑی سردی لگ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ اور دوسرا ہاتھ اس نے گریبان کے پاس کوٹ کے اندر ڈال رکھا تھا۔ کچھ دیر کپڑوں کے بند شال کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنے کے بعد کیر نے سگریٹ پینے لگا اور ریل سے شیش کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

گڑوں پر دھند مائل تھی۔ کار پر ریل کی قیادیں مل رہی تھیں اور بڑی کمزور روشنی دینے دی تھیں۔ سخت سردی میں سڑکیں سنسنی تھیں۔ ایک مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے کیر نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔ یہ آواز بڑے مکان کے اندر لٹاف سے آ رہی تھی۔ کیر کے چہرے پر بھی سی مسکراہٹ آئی۔ اس مسکراہٹ میں مصمصیت بھی تھی۔ اور ہلکا ہلکا غر بھی۔ ایک آکا کوٹ کے کمرے کے اجیر میں بند بار رہا تھا۔ کیر کے قدموں کی آہٹ پا کر وہ گھسے پائے کی طرف غصہ پڑا ہوا ہانک گیا۔ اور آخر سڑکوں پر آواز گوی کرتے کے بعد کیر اپنے محلے کے گرد و نواح میں آگیا۔ ایک قلی کا موڑ گھومتے ہوئے کیر کو ایک سپاہی نے روک لیا۔

"کون ہو بھئی؟"

"توئی۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر؟"

"اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"گھر جا رہا ہوں۔"

"گھر سے آئے ہو؟"

"شیش سے۔"

"وہاں کیا کرتے تھے؟"

میں ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ یہ خالی مکان ہیں اور ان میں ایک بھی زمین
انسان نہیں رہا۔ حالانکہ ایک ایک مکان میں چار چار کنبے لگا ہوا تھے۔ یہ کنبی قتل
افسوس بات تھی کہ دن کو جو مکان زندگی سے بھرپور ہو رات کو وہی قبر کی طرح چپ
چاپ اور سسٹن ہو جاتے۔ کبیر کا میگزین پینے کو ہی چاہا۔ لیکن سردی میں ہاتھ باہر
نکلنے کو اس کا جی نہ چاہا وہ ایک ہاتھ کوٹ کی بیٹ میں اور دوسرا ہاتھ گریبان کے
اندو ڈالے۔ چپ چاپ سر جھکا کر گلی میں سے گزرا کیا۔ ایک جگہ سوڑ گھومتے
ہوئے کبیر ٹھک کر رو گیا۔ اس کے سامنے ایک لڑکی کالے بڑھیک کی چھوٹی سی گھڑی
ہاتھوں میں قہارے ایک مکان کی دیوار سے لگی گھڑی تھی۔ سیاہ برقعہ چہرے پر سے
ٹھپ لگا ہوا۔ کھار رنگ دہلا چلا جسم اور کپڑوں کے بلب کی ہلکی روشنی میں جھلکی ہوئی
گھڑی ہوئی آئینیں۔ کبیر رک گیا۔ لڑکی نے وہاں سے ہٹ گئی کی ذرا سی بھی کوشش
نہ کی۔ کبیر نے پاس جا کر پوچھا

”جی ہاں رات گئے۔ اکی سردی میں ہم یہاں کیوں کھڑی ہو؟“
”اکی اپنی کالی کالی چٹکی آٹھویں سے کبیر کو دیکھتی تھی۔ اور دیکھ کر ہلے۔ کبیر
نے ایک بار پھر پوچھا۔“

”جی کون تو؟“
”لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کبیر نے پوچھا۔“
”کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟“
”لڑکی نے گلی میں سر جھکا کر کبیر کے سر جھکا کر اور کچھ ہونے لگا۔ پھر سر اٹھا کر
پوچھا۔“
”جسم پہلے کیوں رہتی تھیں؟“
”لڑکی نے تھوڑے سے کہا
”میرے گھر میں۔“

”اور کبیر نے پوچھا۔“
”میں بھی نہیں۔“
”لڑکی کی تواضع میں احمد اور قوت ارادی کی جھلک تھی۔ اس کا چہرہ چمکی سو رہی
کی طرح اپنی جگہ پر جتنا سنجیدگی سے لگا ہوا تھا۔ وہاں تو بیکراہت کا نشان تھا اور
نہ ہی پریشانی کے آثار تھے۔ صرف ایک اڑاسی کا سایہ تھا جس نے اس لڑکی کے

”کبیر کرے۔“
”پہلی نے جسے پوچھ کر فوراً سے کبیر کا چہرہ دیکھا۔
”رات کو کون کبیر کرے؟“
”میں۔“
”پہلی نے کبیر کا بازو پکڑ کر کہا۔
”میں نہیں میرے ساتھ قہارے چلنا ہوگا۔“

”پہلی نے کبیر کو ساتھ لے کر قہارے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ ٹول چپ
رہے اور کوئی نہ بولا۔ پہلی جہاں ہو رہا تھا کہ یہ کیا تھی ہے کہ اکی رات کو اتنی
سخت سردی میں اس کے ساتھ بغیر تیل و بجٹ قہارے چلے پریشانی ہو گیا۔ اس نے
ایک بار بھی پہلی کو یہ نہ کہا کہ معاف کر دیں اور پھر رشتہ کی قیما کچھ نہ کی۔
دراصل پہلی کا مقصد ہی رشتہ لڑنے تھا۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ ختم سردی میں
کسی شخص کو لے کر قہارے تک کا راستہ پیدل لے کر جائے۔ چنانچہ کبیرے رات
میں ہی پہلی نے ہمت ہار دی۔ اس نے ایک آخری کوشش کی کہ نہ ہو گیا۔
”تمہارے پاس کچھ ہے؟“
”کبیر نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“
”پہلی نے پوچھا۔“

”میں۔“
”کھاتے کہاں سے ہو؟“
”جہاں سے کھانا ملتا ہے۔“
”پہلی نے ہاتھ ہٹ کر کہا۔
”ہاں ہاں میری جان چھوڑو۔“

”پہلی جیسے مڑ گیا۔ کبیر آگے چلا رہا چوک میں جا کر وہ ایک ایسی گلی میں مڑ
گیا جو آگے چل کر اس کے مکان کی طرف جا نکلتی تھی۔ گلی ویران تھی۔ بج بڑ
سردی میں ٹھہرے ہوئے مکان دھند میں سے کھڑے تھے۔ کسی بھی مکان میں روشنی

”تو سن مارتے اس کمرے کا کرایہ نہیں دے گا۔“
 لڑکی نے موسمِ حج کی دھبی روشتی میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں
 سوائے ایک چارپائی پرانی سی میز، ایک آرام کرسی، ایک صراحی اور شیشے کے گلاس
 کے اور کچھ نہیں تھا۔ آدھا میز پرانی کتابوں نے گھیر رکھا تھا۔ چارپائی پر بیلا برا کلاف
 اور ہنر کھلا ہوا تھا۔ دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکا رہا تھا جس میں لاہور کی بادشاہی مسجد کی
 تصویر بنی ہوئی تھی۔ کبیر نے آرام کرسی پر بیٹھ کر سرگٹ سلگاتے ہوئے کہا:۔
 ”تم چارپائی پر سو جاؤ۔“

”اگر تو تم؟“
 ”میں اس کرسی پر سو رہوں گا۔“
 ”تو کیسے سو سکتا ہے؟“
 ”میں کیا جانتی ہوں کہ تم آرام کرسی پر سوؤ اور میں چارپائی پر آرام کروں؟“
 ”تو مطلب قلب میرا مطلب تھا کس؟“
 ”کبیر نے چارپائی پر سے کھلی اٹھا کر اوپر چلے ہوئے کہا:۔
 ”اب اس کمرے میں اب تو کوئی چارہ نہیں کہ تم چارپائی پر لیٹو اور میں اس کرسی پر
 چار رہوں۔“

”اگلیا اس کرسی پر چھپیں خیر آجائے گی؟“
 ”وہی تو خیر بیٹھ میرے تعاقب میں رہتی ہے۔ لوگوں کے توجہ کو نہ دیتی ہے۔“
 ”الاکم رات تو کتنی دیر جاگتی ہے؟“
 ”میں تو کب کیسے سو سکتی ہوں؟“
 ”تو کیا تم جانتی ہو کہ میں بھی چارپائی پر سو رہا ہوں؟“
 ”لڑکی نے منہ دھڑکی طرف کر دیا اور برقعہ اٹھانے لگی۔ کبیر نے اپنے آپ کو
 کھلی میں انہی طرح لیٹ کر چھپ گئی۔ فرش پر بیلا دیں۔ برقعہ اتار کر لڑکی نے کیلنڈر
 والے کھل کے ساتھ لٹکا دیا۔ کبیر نے کیلنڈر
 ”اب چپم نے بادشاہی مسجد پر قنداق ڈال دیا ہے۔“
 ”لڑکی نے ہنسنے لگا۔ کہا:۔
 ”کیا کون سے یہاں پور کوئی کھلی ہی نہیں ہے؟“
 ”جواب سوجاؤ۔“

سارے دھڑ کو لیٹ میں نے رکھا تھا۔ کبیر نے پوچھا:۔
 ”کیا تمہارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں؟“
 ”میرے پاس بھی نہیں۔“
 ”کبیر نے لڑکی کے پاس اس لڑکی نے آہستہ سے کہا:۔
 ”اگلیا تم ایک بے سار لڑکی کی مدد نہ کرو گے؟“
 ”کبیر نے اس لڑکی کے پاس آ کر کہا:۔
 ”تم مجھ سے کسی مدد چاہتی ہو؟“
 ”مجھے رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہیے۔“
 ”کبیر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر ہلا کر بولا:۔
 ”اچھا۔ آؤ میرے ساتھ۔“

لڑکی کبیر کے ساتھ ہو گئی۔ کبیر اسے دو ایک گلیوں میں سے گھرا کر اپنے مکان
 کے پاس لے آیا۔ اس نے لڑکی کو ایک طرف کھڑا کیا اور کہنے لگا:۔
 ”تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔“
 لڑکی نے انہماک میں سر ہلایا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کبیر پھونک
 پھونک کر قدم اٹھانے اپنے مکان کے پاس گیا۔ اندر ہی بجلی ہوئی تھی۔ بند دروازے
 کے ساتھ کان لگا کر بٹنے کی کوشش کی۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کبیر خوش ہو گیا۔
 اس نے آہستہ سے دروازے کے ایک پتے کو اندر دھکیلا اور اندر کھلا تھا۔ کبیر آگرا
 ہوا لڑکی کے پاس واپس آیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پیچھے آئے کہ
 کہا۔ لڑکی کبیر کے ساتھ ہوئی۔ وہ لڑکی کو لے کر مکان کے آگے میں آ گیا۔ اس نے
 اپنے کمرے کے پاس جا کر ٹالا کھولا اور بولا:۔
 ”اندر آ جاؤ۔“

لڑکی اندر آ گئی۔ کبیر نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی ایک طرف چپ چاپ کھڑی
 تھی۔ کبیر نے جب سے موسمِ حج نکال کر چلائی اور میز پر لگا دی۔ لڑکی نے پوچھا:۔
 ”کیا یہاں بجلی نہیں ہے؟“
 ”جی ہاں۔“
 ”کیوں؟“

لوکی نے گھڑی میز پر رکھی اور خود بچھونے میں لیت کر لٹا اور کھڑا پھر
 اس نے لٹاٹ میں ملے سے تھپا ہر کان کر کے کہہ دیا۔
 "موم ہی بچاؤں"۔
 "اگر تھیں اندھیرے پر اندھ ہے تو بچاؤ"۔
 "مجھے تم پر اندھ ہے"۔
 "ایسی غلطی پھر بھی نہ کرے۔"

چنانچہ موم ہی جلتی رہی۔ لوکی کبیر کے ہنر میں لٹی رہی اور کبیر نے اپنی بوسیدہ
 آرام کرسی میں کھل میں لپٹا دھسا رہا۔ نیند کے نکلے اب شہر ہوا گئے تھے کبیر کی
 آنکھیں پر جمل ہونے لگی تھیں۔ گرم کھل میں آنے کے بعد نیند نے اپنی چوری
 طرح لٹاٹ لپٹا لیا اور وہ سو گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھل گئی نہ موم ہی کو می
 مل بھی تھی۔ کمرے میں اس کی دھبی دھبی وہ مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی پرشے
 دیے ہی تھی بھی ایک ٹھنڈا مٹلے تھی۔ لوکی لٹاٹ میں وہی سو رہی تھی۔ ایک دو بار
 دیکھ کر اس کے غور غور نے کی آواز سنائی دی۔ جس طرح بلی اپنے بھوکے پیٹے کے
 بعد گرم گرم چمچے کے پاس لیٹ کر غور غور ہے کبیر نے نیند چوری کر لی تھی۔ لوکی
 کا ایک ہاتھ لٹاٹ سے باہر تھا وہ ہاتھ کی کلائی پر پھولی ہی سنہری گھڑی بندھی تھی۔
 اکیر نے قریب جا کر وقت دیکھا پوسے تھا پانچ رہے تھے۔ جب وہ وقت دیکھنے کے لئے
 لوکی پر ہلکا تو اس لٹاٹ میں سے لوکی کے جگے جگے ساہنچ لینے کی آواز سنائی دی اور
 حنا کے مٹری گھڑی گرم خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ دھلیز اگر اپنی کرسی پر ابیم ورا
 ہو گیا۔ اب اتنے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب اسے نیند کی ضرورت بھی نہیں تھی۔
 اب وہ اپنے چاہتا تھا کہ یہ لوکی کون تھے، اپنے اپنے ہی، کمرے سے نوہ دیکھا وہ
 جانتے کیونکہ ہو سکتا ہے کبیر کبیر کے قرض خواہ کی یا سچ دیاں سن دھکیں۔ لیکن
 لوکی گھوڑے چ کر سو رہی تھی۔ کبیر اسے یہ ارادہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے آج تک
 نہ تو کسی کو سونے کے لئے کہا تھا اور نہ اس نے کسی کو سونے ہونے کو بگایا تھا۔ وہ
 پریشان بھی نہ ہوا۔ اس نے سوچا اگر لوکی سو رہی ہے تو سو رہے قرض خواہ آ جائیں
 گے تو آ جائیں۔ اس نے بیویوں میں ہاتھ دھنے لئے اور چپ چاپ کرسی پر نیم دراز
 سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگا۔ جس پر لوکی کا سیاہ برقعہ لٹکا ہوا تھا۔

"جس میں سے ہے آرام کیا۔ اس کا مجھے اندس ہے۔"
 "ابہ ہنر میں یا تو ان کام ہی نہیں کرنا چاہئے جس کا ہم میں نہیں اندس ہو اور یا
 پھر کسی بھی ایسے کام پر اندس کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ جو ہم سرکے ہوں۔"
 "پھر کون میں تمہاری حکمت کا پتہ لے سکتی ہوں۔"
 "میں ایسا نہیں سمجھتا۔"
 "لوکی چار پائی سے آواز کر رہی تھی۔ اس نے لٹاٹ اپنے سر پر لیٹ لیا۔ پھر گھڑی
 دیکھ کر بولا۔

"ماتے پانچ بجے والے ہیں۔"
 کبیر نے آہستہ سے کہا۔ مجھے اپنے آپ سے چھٹا کر دیا۔
 "پل ابھی کوئی دم میں سنا تو جانے کی۔"
 "لوکی نے کہا۔

"میں سوچ لگنے کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔"
 "کبیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لوکی بھی خاموش ہو گئی۔ کمرے کی چھٹی میں لپٹا
 ٹوٹا ٹوٹا چھٹی اس خاموشی میں صرف اس چمچے کی گھڑی پر دھلیز تھی چ
 ٹالی میں سے روز اسٹان کے کمرے سے فوج آ کر کبیر کی کرسی کو کھڑا کرنا تھا۔ لوکی
 نے آواز پر کان کھڑے کر کے کہا۔
 "چمچا ہے کہیں۔"
 "کبیر نے کہا۔

۱۰۰ - مسلمانان کا نام کیا ہے؟ -

”کیسے ہے لاہور میں رہ رہے ہو؟“ ”راہِ نیاں نکال رہے ہیں۔“
 ”جیتنے کا ارادہ کیا ہے۔“ ”جیتنے کا ارادہ کیا ہے۔“

۳۳۴

میں نے اس کو دیکھا تھا کہ وہ ایک بار اس کے پاس گیا تھا۔

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

اور یہ بھی گاہے صرف دو بارگ ہیں جو کام کرتے ہیں۔ میں نے کام پہنچوڑ دیا۔

۱۰۔ ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو "میں" کہتا ہے، وہ اپنے آپ کو "میں" کہتا ہے۔
- لیکن اگر وہ کہتا ہے: "میں" کہتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو "میں" کہتا ہے۔

ہماری تمام ایک ہی طاقت میں منبہ یہ کہ معلوم کر لیں چاہتی ہو کہ وہ لڑکی جس پر بی - ایک بار پھر اس کے "سفید" دانت نمایاں ہونگے اور ایک بار

پھر اس کا حلیہ بدل گیا۔ اور وہ دوسری لڑکی معلوم ہونے لگی۔ اس کے بعد اس نے خود ہی بتایا کہ اس کا نام زہرا ہے۔ اس کا باپ اور ماں دونوں بڑے بھائی فخرات ہیں۔

”ہاں میرا دوست ہے کہوں کا مطالعہ کرتے آتا ہے۔“

اس کی وجہ سے اس نے اپنے اور بہو کو سزا دے اس کے چہ کاٹنے

پہلے چاہا تھا۔ اور وہ کوئی دوسری لڑکی نہ لے سکتا تھا۔ لڑکی نے کہا۔

لوئی کا چہرہ ایک دم تھلہ ہو گیا۔ اس نے آپ کیس بھیج دی اور یوں ہے۔

شعر: "کھیرے کوئی جواب نہ دے گا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا مگر اس کا دل تیرا پیچھا رہا۔"

اسلامی کہتے ہیں اس پر ایک کراہی ہے، تاہم ہر کوئی کی پیروی میں نہیں آتا۔ اور ہر کی طرف دیکھتے ہیں۔ لڑکی کے پاس رات بھر رہنے کی وجہ سے گھر میں رہتے ہیں۔

”تم نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ اور رات کو کسی

کیر نے کہا :-

”کیوں نہیں؟ آخر تم میرے میں کیا سوچ رہے ہو گے؟“

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے کبھی اس کی طرف سے کوئی دعا مانگا ہے۔"

جس میں رات بسر کرنے کے لیے ایک چائے کی دکان اور پھر ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر

”میں نے تہبہاری کوئی آوارگی نہیں دیکھی“

”جو لڑکی رات کو ایلی.....“

نکل کر دیکھ گئے تھے یہ وہ فیروز پور کی رہنے والی تھیں۔ جنتیم کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور میں آکر رہنے لگی۔ ماں کو دو روز بیمار رہا کہ اللہ کو بخاری ہو گئی۔ اب وہ اس دنیا میں اکیلی تھی۔ اور ارشد و ایدوں کے رحم و کرم پر تھی۔ دو سچ سے شہم تک ان کے گھر کا شمار کام کاج کرتی۔ بھانڈو وینچ بڑن مانجھی۔ مالک جھاتی۔ ان کے بچوں کی گندگی بہانہ کرتی۔ کپڑے دھوتی یہ کیا پکائی۔ ہسٹ لگائی۔ بڑی لاش کے پاؤں واقع۔ بچہ وہ جوان ہو گئی تو رشہ دار لوگوں نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ وہ ایک سے دو بچ گئی۔ لیکن وہ ایکس کے وہ قابو آگئی۔ وہ اپنی بصیرت کو جان سے زیادہ بخاری چیز سمجھتی تھی۔ اسے بھی اپنی آنکھ اسی طرح مڑ گئی جس طرح تیز شریف زادی کو ہوتی ہے۔ مگر وہ پانی میں رہ کر کمر چھ سے بچ نہیں سکتی تھی۔ اور اسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ خدا بھی اسے ان ہوس و رعون سے نہ بچا سکا جس رات پہلی بار مکان کی اوپر والی اندھیری کو غصی میں اس کی صصت لونی گئی تو اس کے سینے پر چاقوں کی نوک رکھ دی گئی تھی۔ اس رات کوئی خوفان نہ آیا۔ کہیں بھی بجلی نہ گری۔ کسی مندر سے کوئی دیو نہ آیا اور کوئی خدا بھاگ کر اس کی مدد نہ کیا۔ آپا کسی معبد کا کلس نہ گرا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ آسمان پر گھرے اسی طرح چٹکتے رہتے تھے نہ تھے ہاتھوں میں چپ چاپ سوئے رہے۔ پہول اپنی والوں میں چپے چپے ہونے کا اظہار کرتے رہے۔ سب کچھ دیکھ ہی رہا۔ جیسا کہ اس سے پہلے قلم لکھ لکھتے تھے۔ انھوں نے عورت بن گئی۔ اب وہ ہر موٹن کار رشتے دار کی ہوس کا نشانہ بننے لگی۔ گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے مل کر انھوں کو خوب مارا۔ خراموڑی اٹھانے بچوں کو خراب کرتی رہے۔ انھوں غاصوش سے مار کھاتی رہی اور انھوں سے بچنا نہ ہوتی۔ وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ وہ تو ان عورتوں کے جوان بچوں کو خراب کر رہی تھی۔ جسی اسب کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن ان رشہ دار عورتوں کے پاس ایک عمل موجود تھا۔ انھوں نے دس ہندوہ دونوں کے اندر اندر انھوں کی شادی کر ڈالی۔ انھوں اپنے گھر چلی گئی۔ یہ شادی اس طرح ہوئی تھی۔ کہ انھوں کے خاوند نے ان عورتوں کو پانچ سو روپے نقد دیے تھے۔ ایک ماہ تک انھوں اپنے گھر میں ٹھیک بھاگ رہی۔ مگر ایک ماہ گزر جانے پر انھوں کے خاوند کو اپنے پانچ سو روپوں کا خیال ستانے لگے۔ اس کا خاوند کسی زیادے میں ایک گلو پارا تھا۔ اس نے بڑی کر کے گلو ہارے کا کام چھوڑ دیا اور شہر میں آکر ایک خطیغ کے بے ہاں غلام ہو گیا۔ یہاں سے قری کر کے کے بعد اس نے وہ عورتیں اپنی خرید کر

دیکھ لیں اور ان سے پیش کر دیا۔ شروع کر دیا۔ پھر اس نے ان عورتوں کو فروخت کر دیا اور خود شہر میں ایک چک چائے کا چھوٹا سا ہوس کو مل لیا۔ انھوں نے شادی کے بعد جب اس نے دیکھا کہ انھوں ابھی جوان ہے۔ اور خوش شکل بھی ہے۔ تو اس کی فطرت نے ایک بار پھر خوش مارا۔ طبیعت کی اصلیت ایک بار پھر سامنے آگئی اور پھر اس نے انھوں پر پانچ سو روپے بھی خرچ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے خیر آباد خندہ کے ایک ہندو فروش سے بات کر کے انھوں کو ایک ہزار میں فروخت کر دیا۔ اور خود ہوس کو خیر آباد کمر چھوڑ دیا۔ جا کر قلعہ گری کا کام شروع کر دیا۔ انھوں کا نیا مالک اپنے خیر آباد خندہ کے کیا۔ یہاں اس نے انھوں سے پیش کر دیا۔ چلا تو انھوں نے ہی چھوٹی۔ وہ اپنی زندگی ہرگز ہرگز اختیار کیا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک شریف خاوند کی ایک دہی بن کر زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن رعایت نے اس پر پاک باز زندگی کے تمام وہ اذیتے بند کر دیئے۔ انوں ہاتھوں طرف سے ہر کاری کے جتنوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ بلکہ جب اس نے اپنی چاک کے سلیٹے میں رعایت کو پوری طرح سازگار پایا اور عیب زندگی کے تمام امکانات کو مفقود دیکھا تو وہ یہ سمجھنے لگی کہ خدا کی رضا بھی شاید اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو رعایت کے اسیر کر دے۔ نہ کہ انھوں نے شروع شروع میں بے حد احتجاج کیا مگر اس کی کوئی فہم نہ گئی۔ نہ کہ انھوں نے اپنی ہی مرضی طرح پیش کر دیا۔ وہ اپنے طرح طرح کی باتیں دیا۔ اور مجبور کرنا کہ وہ اپنی پر آباد ہو جائے۔ انھوں طرح طرح سے جتن کر کے کہ اپنی طرح وہ اپنی اپنی مانعہ عزت و آبرو پر محفوظ رکھ سکے۔ لیکن گزری کا چھوٹا سا ہوس سمندر کے طوفانی ریلوں کا کتب تک متاثر نہ کر سکا۔ یہ آخر عمل ٹوٹ گیا۔ اور طوفان کا پانی لکڑیوں کے ٹکڑوں کو بنا کر لے گیا۔

سندھی مالک نے انھوں سے پیش کر دیا۔ شروع کر دیا۔ انھوں کو بکر سے باہر قدم دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ کوئی دو سال تک انھوں کا خون پینے کے بعد سندھی مالک نے لاہور کے ایک ہندو فروش کے پاس اپنے عزیز ہزار میں فروخت کر دیا۔ انھوں اپنے سے مالک کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ یہاں آکر اسے شہر سے باہر ایک مکان میں بند کر دیا گیا۔ اس مکان میں ایک بار پھر گناہگار زندگی کا دور شروع ہو گیا۔ ابھی زندگی جس کے گڑھے میں انھوں نہ چھل دی تھی۔ لیکن آخر ایک دن انھوں کا سوا ہوا خیر بیدار ہو گیا۔ ایک رات اپنے سر پر ایدوں کو غافل

پانچ زینوں نے اپنے چند ایک کپڑوں کو سمیٹا اور اندر چلی۔ سو اور سناٹا رات نہیں
ایک گھنٹے باہر نکل آئی۔

”اس کے بندھے تم میں گئے“ میں نے تم سے رات بسر کرنے کی التجا کی اور تم
مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے لے آئے۔ میں یہ میری زندگی کی گنتی کو بیکاراب تم مجھے
عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہو یا نہیں؟“

کچھ کرسی پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بہت جلد زینوں اپنی داستان سنائی دینی وہ اسی
طرح کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا ہی وہ ایک بار سگڑت پینے کو چاہا مگر اس کی عادت تھی
کہ وہ غالی معدے کو کبھی سگڑت نہیں پھا کرتا تھا۔ رات کو بارہ بجے وہ سگڑت چاہا
کر دیا کرتا۔ اور پھر چائے پینے سے پہلے کبھی سگڑت لے پیتا۔ وہ دوسری بات معلوم
کی طرح اپنی اس عادت پر بھی پوری اپنی سنے کا بندھ چکا تھا اس خواہش کو بھی
اس نے دبا دیا اور سگڑت کی دنیا کو باہر نہ نکالا۔ باب زینوں نے اس سے پوچھا کہ کیا
اب وہ اسے برا سمجھ لگاتے ہیں اس نے کہا۔

”دانش کائنات کی ہر شے کا احرام کرنا ہوں۔ اور عورت کی سب سے زیادہ
عزت کرنا ہوں۔ میری نگاہوں میں تم بری نہیں ہو۔“

”زینوں نے کہا“ ”اور“ ”میرا خیال تھا کہ رات کو تم میرے ساتھ اسی چار پائی پر سو گئے۔ فوراً تم
ایسا کرتے تو میں کوئی اعتراض نہ کرتی۔ مگر میں خیرا ہوں کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔“

”کچھ خاموش رہا۔ زینوں نے غمزہ دوپٹے کو ٹھیک طرح سے بٹاتے ہوئے کہا۔
”تم بولنے لگیں ہو۔ کیا تم مجھے تھوڑے کے کہ تم نے اس چل کو اٹھانے سے کین انکار
کر دیا جو خود بخود تمہاری جموتی میں آتا تھا؟“

”کچھ بولنے والی تو ہی انداز کر سرتا ہوا تھا۔ پھر اور بولا۔
”اب ہمیں نے اپنے چل کو بھی ہاتھ نہیں لگایا جو اپنے آپ میری جموتی میں آتا
تھا۔“

”کیا تم والی سے چل توڑ کر نکالتے کے عادی ہو؟“

”نہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ والی پر گئے ہوئے چل کو میں محبت اور عقیدت
کی نگاہ سے دیکھ کر گذر جاتا ہوں۔“

”اور اگر وہ کہنے کے بعد زمین پر گر پڑے تو؟“

”تو میں اسے اٹھا کر اس کے بالک کے حوالے کر دیتا ہوں۔ گرتے ہوئے چل
کی میں والی پر گئے ہوئے چل سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔“

”سو اگر اس کا کوئی بالک نہ ہو پھر کیا کرے؟“
”میر میں اسے زمین کے حوالے کر دوں گا۔ زمین سب کی مائے ہے۔ پھر سب
کی مائے ہے۔“

”زینوں نے چہرے پر غمزہ تھا۔ وہ انہیں مجھے بغیر کبر کی باتیں سن رہی تھی۔
اس نے اس قسم کی باتیں پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ باتیں کچھ کچھ ان کی سمجھ میں
آ رہی تھیں۔ اور کچھ کچھ بالکل نہیں آ رہی تھیں۔ کچھ نے پوچھا۔

”تمہاری گنتی کیا بھاری ہے؟“
”زینوں نے اپنی گنتی پر غمزہ ڈال کر کہا۔
”تمہارے چل کا رعبہ ہے۔“

”کچھ نے اسے ہنسے کہا۔
”اب جسیں بیٹھا ہے وہ چل چاہیے۔ آ۔“

”ہاں۔۔۔ اگر تم ایک شخص اور بیٹھی رہیں تو اسی گنتی نہ کوئی فرق خواہ
میں دھمکے گا۔ اور میرا میں سے ہی کر لانا مشکل ہو جائے گا۔“

”زینوں نے حیرانی سے پوچھا۔
”کیا تم ہاتھ نہیں کر کے؟“
”میرے پاس صرف تین آٹے ہیں۔ اگر تم پتہ کر دو تو میں چھینا بازار میں جا کر
چائے کی ایک پیالی چلا سکتا ہوں۔“ اس کے علاوہ میں اگر ہاتھوں بھی تو سہاڑے لے
کچھ نہیں کر سکتا۔“

”زینوں نے گردن ہٹا کر کرسی پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چھوٹے سے
کمرے میں بیٹھے گا۔ زینوں کا خیال تھا کہ اس شخص کے پاس آٹے چاہوں جائے گی۔

”یہ اگر پنجہ بھی ملی تو کم از کم آٹا ضرور ہو گا کہ وہ ایک دو روز اس کے پاس رہ کر اپنی
تجربہ بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں کئی پروگرام کی تشکیل ہی کر سکے۔ لیکن یہ
شخص تو اسے کمرے ہی باہر نکل رہا تھا اگرچہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا اور خود بھی
زینوں کے ساتھ دن بھر کے لئے کمرے باہر نکل رہا تھا۔ پھر بھی زینوں کو بڑی

نامیدی ہوئی۔ اس کے ساتھ شردندوں سے بھرنے والے جنگ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ جہاں سے اسے اپنی گزرتا تھا اس کے گھیرنے پر چلنا۔

"کیا تم مجھے کچھ روز کے لئے اس کمرے میں رہنے کی اجازت نہیں دے گے؟"

کیر نے کڑھ جھکا کر کہا۔

"میرے پاس کچھ نہیں۔ تم ایسے کمرے میں بھری رو لو گی۔ جہاں قرض تو لیں گے لینے والے ہار بار تقاضہ کرتے آتے ہوں؟"

زخون نے کہا۔

"میرے پاس کچھ اجازت ہیں۔ تم انہیں بازار میں بیچ دو۔ کچھ دنوں تک گزارا ہو جائے گا۔ اس کے بعد پھر کچھ سوچ لیں گے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا زور بازار بیچے جاؤں گا۔ تو کتنا دھچ پر مجبور کر لے گا۔ اور پولیس کے حوالے نہیں کرے گا؟"

کیر نے سر ہلا کر استہ سے کہا۔

"میں نہیں مجھے یہ گوارا نہیں۔ ابھی تمہارے پاس فخریت ہیں۔ ابھی تم ان کے سہارے جہاں چاہے رہ سکتی ہو۔ جب تمہارے پاس کچھ نہیں ہوگا تو تب تک میرے پاس آجائے۔"

زخون نے حیرت سے کہا۔

"کیا تم ایک بے سارا عورت کو سارا نہیں دے گے؟"

"حقیقت یہ ہے کہ میں کسی عورت کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ ویسے اس کمرے کا دروازہ ہر رات بارہ بجے کے بعد تم پر کھلا ہے۔ تم جس رات بھی چاہو بارہ بجے کے بعد یہاں آکر سو سکتی ہو۔ بارہ بجے سے پہلے آؤ گی تو یہاں لگا لگا ہو گا۔ کیونکہ بارہ بجے تک لوگ بیویوں کا تقاضہ کرتے آتے ہیں۔ اس کے بعد جاتے کیا سوچ کر سو جاتے ہیں۔" جاتے ہیں زخون کو ہنسی آئی۔ کیر بھی مسکرایا اور ہاتھ مل کر رہا۔

"کیا کہوں میں ایسے ہی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ اس طرز زندگی پر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ لیکن اس سے چٹکارا مشکل ہے اور پھر میں نے بھی کوشش بھی تو نہیں کی۔ سوچا ہوں کوشش کرنے سے کیا ہو گا۔ کوشش تو ایک بے کار فعل کا نام ہے۔ اگر اس کے ساتھ جمل سا ذرا دماغ اور روپوں سے بھری ہوئی جیب نہ ہوتی۔"

"لیکن کم از کم تم اپنے قرض تو ادا کر سکتے ہو۔"

"قرض ادا کرنے کے لئے جو روپیہ چاہئے اور روپیہ پیدا کرنے کے بھی روپیہ چاہئے۔ کچھ بھی پانی کی طرح اپنی سیخ ہموار رکھنا ہے اور صرف اسی کے پاس چاہئے جس کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

زخون ایک بن کے لئے دھڑکی صوف میں کھو گئی۔ پھر وہ ابھی۔ اس نے برقعہ پہنا۔ اپنی محضری اٹھائی اور بیٹے کے لئے تیار ہو گئی۔ کیر ان کے ساتھ وہیے پاؤں آگن میں سے گزرا کر باہر گئی۔ ان کی گلی میں صبح کی دھند چھیلی ہوئی تھی۔ شاید وہ شہر سے کسی باہر مشرق میں سڑک چلی ہو چکا تھا۔ مگر دھند کی قہ اسے شہر والوں سے چھپانے ہوئے تھی۔ لیکن اسے باہر نکل کر کیر بازار کی کھڑ پر آکھڑا ہو گیا۔

(۲)

زخون بھی کیر کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس نے کالے برقعے میں اپنے آپ کو پیٹ رکھا تھا اور سووی میں غصہ رہی تھی۔ زخون نے سوائے پوری آستینوں کے سوائے اور کوئی بھی گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے چلی چھٹ اٹھانے والی میں بیٹھ کر چائے پی اور ایک ایک بکسین پیر کھائی۔ کیونکہ زخون نے کیر کے لئے دیا تھا کہ اس کے پاس ہاتھ میں کچھ روپیہ ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ کرانے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر سڑک پر آکر کھڑے ہوئے۔ اب اوپر اوپر سڑکوں پر بے مقصد پھرتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ کیر نے پوچھا کہ کیا تم کبھی جاؤ گی؟

زخون نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

اس طرف۔

زخون نے اشارہ کیا کہ وہاں کون ہے؟

اور تم کبھی جاؤ گے؟

کیر کے مشرق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس طرف جاؤں گا۔

پر جاکر دیکھ کر بڑی حاسد ہوئی۔
 شہدہ نے زخون کو صوفے پر بٹھا کر سیرکٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
 "میں ایک وکیل کے پاس گئی ہوئی تھی۔ میں کوئی ایک شخص ہوا واپس آئی ہوں
 مگر تم اپنی رات مجھے کہیں بھرپی رہی تھی؟ کیا تم وہاں سے بھاگ آئی ہو؟"
 شہدہ نے سکتی ہوئی انگلیوں زخون کے آگے کر دی تھی۔ زخون انگلیوں پر
 ہاتھ پھیلانے پر اس کی ہرکی کھائی ہوئی پیروی داخل کر دی تھی۔ اس نے بھرت سے
 کہا۔
 "میں بھاگ آئی ہوں۔"
 شہدہ نے زخون کے لئے جانے کا اشارہ کیا۔
 "تم نے اچھا کیا جو میں عالم کے نیچے سے نکل آئیں۔ اب وہ تمہارا کچھ نہیں
 کر سکتا۔"

زہن نے اس پر کھنکھایا۔
 "جین میرا کوئی پھر نہیں ہے شادی۔ میں اگر اسی طرح سڑکوں پر باری باری
 پھرتی رہی تو ایک نہ ایک دن وہ ظالم مجھے اپنے چال میں پھاس لے گا۔"
 شادی نے زہن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
 "کیسی باتیں کر رہی ہو زہن! کیا میں تمہاری سسلی نہیں ہوں؟ پھر میرا ہی
 میں تمہارا بھی ہے۔ اس پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا ہے۔ تم بڑے
 اطمینان سے پہلی رو سکتی ہو۔ تم وہ دل فل کر کام کر سکتی ہو۔ تمہاری قسمت تمہارے
 ساتھ ہے اور میری قسمت میرے ساتھ۔ اور پھر میں بھی تجاری محسوس نہیں کروں گی۔"
 "کہہ رہے ہیں ایک کہہ رہے ہیں تم وہ لہنا۔"
 زہن نے شادی کا محبت سے ہاتھ دبا دیا۔

تہذیب سے متعلقہ تعلیم! تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے مگر میں اس پر زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ چاہتی ہوں کسی سے دوستی کے پڑھواؤں اور شرطنامہ زندگی بسر کروں۔

مشاہدہ سے سر ہٹا لیا۔ کمرے میں غائبوشی چھا گئی۔ پھر وہ سراخا کر کہنے لگی۔

[illegible][illegible]

دیا اور مکان کے کرائے کے علاوہ اسے ہر ماہ تین سو روپے دینے لگا۔ وکیل بھی خود اس کے پاس آ جاتا اور بھی اسے اپنے ہاں ٹھہرایا کرتا۔ شاید وہ سال سے اسی وکیل کی داشتہ بن کر رہ رہی تھی۔ اس وکیل کے چھ بچے تھے اور بڑی جید حیات تھی۔ لیکن اس کی کمائی بچوں کے اخراجات سے زیادہ تھی۔ یعنی اتنی زیادہ تھی کہ وہ آسانی سے ایک داشتہ کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے شاید وہ داشتہ بنا لیا۔ شاید وہ وکیل نے اپنی اہواز دی رہی تھی کہ وہ بھی کسی کسی دو سرے مو کے ساتھ رات بسر کر سکتی ہے اور اس کے خوش بر ماہ شاید کی جگہ اس میں تھے جہاں روپے گنت لیتا تھا۔ یعنی اس طرح شاید وہ سو پچاس روپے مل رہے تھے۔ لیکن شاید ایک چھپ کر چار پچاس لگی اور اس سے زیادہ کمایا کرتی۔ اس نے بچوں کو مشورہ دیا۔

"تم اگر چاہو تو میں جنہیں ایک ایسے آدمی سے ملوا دوں گی جو جنہیں یہی پٹے پٹے ہر ماہ دو سو روپے دے دیا کرے گا اور تم کو اپنا کام کرنے کی بھی اہواز ہو گی۔" جنہیں صرف بچے میں ایک دو بار اس شخص کے پاس جا کر رات بسر کرتا ہے گی۔ وہ بڑا امیر آدمی ہے۔ اس کا کارخانہ ہے۔"

بچوں نے میرا ملا۔

"میں شاید مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں ایک شرط پر آمادہ ہوں کہ وہ رات بھر چاہتی ہوں۔ میں اس زندگی سے نکل آ جاتی ہوں۔"

شاید نے وہ سراسر گریٹ لگا کر کہا۔

"میں جنہیں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ شرط یہ ہے کہ اب ہمارے بس میں نہیں رہتی۔ ہم اگر دس بار بھی جاکر آئیں تو لوگ ہمیں دھڑکی ہی کہیں گے۔ چلا جاؤ تم کیا کرو گی؟"

"میں کسی دھڑکاری کے سکول میں داخل ہو جاؤں گی اور سنا پڑھنا کر کے اپنا پیسہ پالوں گی۔"

شاید خاموش ہو گئی اور اچانک میں چلتے ہوئے کوئلوں کو سمجھ گئی۔ تو کوئی اندر آ کر چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ شاید نے اسے چائے کے لئے پانی گرم کرنے کو کہا۔ پھر گریٹ کی راکھ جھاڑ کر دی۔

"اچھا ہے۔ تم یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ میں کوئی زبردستی جنہیں اپنی دشا میں نہیں لانا چاہتی اور پھر اس دنیا کے خبیث و فراز سے تم واقف ہو۔ اگر دھڑکاری سیکھ کر تم

شادی کر دو گی۔ تو پھر کیا ہو گا۔ ایک آدمی تمہارا مالک ہو گا۔ وہ جب اور جس وقت چاہے تمہاری ہڈیوں کو ختم کر دے گا اور وہ تمہارے باقی کو بھی مٹا دے گا۔ تمہارے لئے اس سے شادی کر لیتی ہیں اور اپنی عزت کا معاوضہ لے کر اسے پٹا کرتی ہیں۔"

بچوں نے کہا۔

"لیکن جنہیں اس دنیا میں ایک بھی آدمی اپنی بڑی اپنی بھائی یا اپنی بس کہنے پر راضی نہیں ہو گا۔ کوئی بچہ ایسا نہیں جو جنہیں اپنی ماں کہہ کر پکار سکے۔ شاید وہ بھی تم نے اُن طرح ہی سوچا ہے؟"

شاید کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ گریٹ کو اٹھیں میں سمجھائے لگی۔ اس کے ہاتھوں کا تیل پالش کی جگہوں سے جھڑکاؤ اور مجھے سے سفید عین نظر آ رہے تھے۔

"میں پاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ظاہر کوئی مٹائی دفعہ نہیں رہا۔ ماں نے مجھے میں قاتل نہیں دی۔ مجھے حمل بھری نہیں سکھایا۔ ایک ڈاکو نے مجھے لٹا دیا تھا۔ اور بڑی بڑی پڑاؤں پر کوئی تیار نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیا جو کوں مڑوں؟"

"تم میرے ساتھ چل کر دھڑکاری والے سکول میں داخل کیوں نہیں ہو جاتیں۔ ہم دونوں وہاں مل کر کام کر سکیں گی۔ اور اچھی زندگی بسر کریں گی۔"

شاید نے ایک جگہ ایسی ہی کہہ کر کہا۔

"میں اتنی سست اور آرام پسند ہو گئی ہوں کہ اب سوائے داشتہ بن کر بڑی رہنے کے اور کوئی کام نہیں۔ میں نہ کر سکتی۔ آدمی جس ماحول میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماحول کا اچھا برا اثر اس پر ہوتا ہوتا ہے۔ مجھے جیسے اس ماحول نے مجھے اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اور اب تو میری حالت اس پرندے کی سی ہو گئی ہے جو گروالوں سے ہاتھ نہ کھاتا ہو گیا ہو اور شجرہ سے باہر نکل کر بھی اڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ میں چاہوں بھی تو اس ماحول سے بچھڑا نہیں پا سکتی اور میں تو دنیا سے باہر نکلتا ہی نہیں چاہتی۔"

بچوں نے گردن اٹھا کر کہا۔

"لیکن میں اس ماحول سے ضرور نجات حاصل کروں گی۔"

"سورگ تم یہ فیصلہ کر چکی ہو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔"

[illegible]

نہجوں نے شاہد کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکے۔
 لگے اب اسے اپنی منزل بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اسے کبیر کا خیال پرکھیا۔
 اس نے ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس نے گھڑی ہل کے لئے
 کبیر کو اپنی پٹوں میں چھپا لیا ہو۔ شاہدہ قہقہہ کرنے کے لئے قہل غلے میں پٹی بچی
 بیونکہ نوکرائی نے پانی گرم کر کے اندر رکھ دیا تھا۔ نہجوں نے میز پر رکھا ہوا ایک
 علمی رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کی نگاہیں رسالے کی
 تصویروں پر رہی۔ قصین اور وہ اپنے مستقل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ قہقہے دہنے
 کے لئے ہیرا مل گیا تھا اب وہ پانی آسانی سے ایسے سکول کا کھونٹ لگا سکتی تھی جتنی
 لڑکیوں کو دستکاری سکھائی جاتی ہو۔

دن لگن آیا تھا۔ دھوپ چمکنے لگی تھی۔ شہر کے کئی کونوں اور بازاروں سے
 وحند ٹامب ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں سے نکل کر سڑکوں پر نکل آئے
 تھے۔ اور روز کی طرح بسوں میں بٹہ کر 'بانگن' 'کاروں' 'ریل گاڑیوں' اور ہٹائیوں پر
 سوار ہو کر شور مچاتے، 'ہاتھیں کرتے' 'چٹاول اور پٹے' ہونے نکل کی بڑھ چڑھتے، 'کڑو
 اڑاتے' 'سڑکیں توڑتے' 'فٹ پاھوں کو اپنے ہاتھوں میں لٹاؤتے' جھانکے پٹے جابھرتے
 تھے۔ 'کام' 'کام' 'کام'۔ 'لٹاؤتوں میں' 'لٹاؤتوں میں' 'سکھوں میں' 'گھروں میں' 'ہر جگہ
 کام ہو رہا تھا۔ کارخانوں میں، میٹھیں چل رہی تھیں۔ ہٹلی درجوں پر اور لوگوں کی شیشیوں
 چمکیا جا رہا تھا۔ اجناس کی منڈیوں میں گندی منڈی، 'مٹائی' 'لاٹلی' 'کھلی' 'سیاڑی' 'غیرہ
 فروخت ہو رہی تھی' 'پانی پانی کا حساب ہو رہا تھا۔ کوئی بیب بچا رہا تھا اور کوئی اسے
 دھلف طریقوں سے کٹانے کی ٹھہر میں بیٹھتے۔ دن بڑھا تھا۔ پکھڑوں میں ٹھوں دیکھوں کو
 'اوصویڑ' رہے تھے۔ فٹلی 'امین' 'رام' 'کرنا' رہے تھے۔ 'اشام' بیچنے والوں کے پکھڑوں کے
 باہر پریشان خال لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ پکھڑوں کے اندر بیٹھ کر کوچ اور
 جگ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے دیکھیں زمین آسمان کے قباب ملا رہے تھے۔ اور جڑم
 گھوڑوں میں کھڑے سہمی ہوئی نظروں سے کبھی وکیل کا ہٹ اور کبھی انصاف کرنے
 والے کا ہٹ تک رہے تھے۔ کیا جب قوم کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا تو اس
 پر مقدمہ چلا تھا؟ کسی نے وکالت کی تھی؟ کسی فٹلی نے منشیانہ لیا تھا؟ 'اشام' فروخت
 ہوئے تھے؟ گواہوں نے رشوت لی تھی؟

کبیر اپنے روتے ہوئے 'کرا' 'انجیرس' روڑ پر سے ہوتا ہوا لڑنے لگے۔

کے بعد علی احمد نے پارمنیم کی چینی تخت پوش کے نیچے سے نکالی اور اسے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"کیا ستو گے کبیر جی؟"

"میرا دل میں آئے ستاؤ۔"

علی احمد اکیلت نہیں سر ہٹا کر پارمنیم بچانے لگا۔ پارمنیم کی آواز دوسرے کمرے میں پہنچی تو علی احمد کی بیوی اپنا غصہ پی کر رو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کا خاوند کام نہ کر سکے گا۔ علی احمد کچھ دیر پارمنیم کو سر کرتا رہا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رگ جانک اور پرہیزگار لکڑی کی بیروں والی ٹکڑیوں کو اعلیٰ سے ٹھونکنے بھانے لگا۔ جب باہر اس کے خیال میں پوری طرح سر میں ہو گیا تو اس نے ہاتھ سے پوری ہوا سے کروائیں ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے سروں پر دوڑائیں اور پھر دھمکے سے سر اٹھا کر غزل گائے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ گا رہا تھا۔

چھلے ابر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔

انہ پھول تھے نہ اچھن تھے نہ آتشیاں تھا۔

غزل قسم کر کے علی احمد نے لفظوں کا چاند سا اپنے گھٹے پر رکھا اور انہماک سے ایک بار پھر کثرت شروع کر دی۔ جیسے وہ اپنی پیدائش کے وقت سے وہاں بیٹھا کثرت کر رہا ہو۔ کبیر نے بیگم کے پاؤں کے سبلا۔ اور علی احمد کو سلام کر کے باہر نکل آیا۔

باہر دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ آسمان کھرا بیلا ہو گیا تھا۔ دھوپ کی گرمائش نے سردی کی شدت کو بہت جلد زائل کر دیا تھا۔ شاہد باغ کی کونٹوں اور سڑک کے ساتھ ساتھ گئے ہوئے درختوں پر دھوپ خوب ٹھہری ہوئی تھی۔ پان سگریٹ والوں کی دکانوں اور ایک بوسے میں دیوار پر لٹھی گائے پو رہے تھے۔ کبیر کو فیملیوں کی ایک بھٹی گلی میں سے ہو کر باہر کھیتوں میں نکل آیا۔ یہاں ترکاریوں، چارے اور سرسوں کے کھیت تھے۔ وہ ایک بنگلہ پر رہت چل رہے تھے۔ "اور شافٹ پانی پانی میں سے گر رہا تھا۔ کلو کے کھیتوں میں اونچے اونچے گئے گئے ہوئے تھے۔ ایک کھیت میں کسان غن چا رہا تھا۔ ایک کھیت میں جگہ جگہ بگم کی بھٹی بھٹی ڈھیریاں لگی ہوئیں تھیں اور ان پر غنل کو سے جھپٹ رہے تھے۔ رہت کی پانی پر دو کسان بیٹھے مٹی میں مٹی ہوتی

کنا چوس رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا اور اس دنیا کا آخری گنا چوس رہا ہے۔ بھٹیاریوں کے دونوں کانے بھنگ لڑکے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولے کبیر کو گنا چوستے دیکھتے گئے۔ کبیر نے گواہ گنا ان بچوں میں ہانٹ دیا۔ بچے پہلے تو شرمائے اور لے کر خوش خوش اپنی ماں کے غور کی جانب بھاگ گئے۔ اب سامنے سے ایک بچہ کھڑکڑائی آ رہی تھی۔ یہ بس بھی کبیر پر سڑک کی مٹی ڈال کر گذر گئی۔ اور وہ بیٹے مزے سے گنا چوستا رہا۔

شاہد باغ پہنچ کر اس نے ایک کوارٹر نما مکان کا دروازہ کھٹکایا۔ یہاں کبیر کا دوست اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کاتب تھا اور اس کا نام علی احمد تھا۔ علی احمد کوئی چھ سات برس سے اس کا دوست تھا۔ کبیر بھی کبھی اس سے ملنے اس کے ہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ویسے تو علی احمد کاتب تھا لیکن اسے گائے بھانے کا بھی شوق تھا۔ اور اس کی آواز بھی اتنی ہی تھی جتنی تھی۔ وہ اسے گھر پر ہی مل گیا۔ کبیر اس کی بیٹھک میں آکر تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ علی احمد کثرت کر رہا تھا۔

"کو کیا حال ہے کبیر جی؟"

"اچھا حال ہے۔ یہ کیا لکھ رہے ہو؟"

علی احمد نے قلم کا ب کپڑے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم نام لائل کثرت کر رہا ہوں۔"

"اور پھر خودی سکرانے لگا۔"

کبیر مسوے میں سے کچھ کاغذ لے کر پڑھنے لگا۔ تجزیہ بازی سستی اور گھٹیا تھی اور جگہ جگہ جھکی بند بات کو بھول جھٹک کر لے والے جملوں سے کام لیا گیا تھا۔ مکان کے بھی بڑے قفس اور پلڑے۔ کبیر نے مسوے تخت پوش پر رکھ دیا اور بیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ علی احمد نے سکرانے ہونے پر چما۔

"کیوں پسند آیا؟"

کبیر نے کہا۔

"بہت۔"

کبیر خاموشی سے سگریٹ چتا رہا اور علی احمد خاموشی سے کثرت کرتا رہا۔ علی احمد کی بیوی نے اندر سے چائے بنا کر بھیج دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ ہاتھیں بھی ہوتی رہیں۔ اور اوپر کی باتیں۔ جن کا کبیر یا علی احمد کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چائے

مولویوں کو دھو کر ڈکرے نہیں ڈال رہے تھے۔ مولیاں لمبی لمبی اور مغزولی حسینہ
ادب سے سفید اور پیچے سے سبز۔۔۔۔۔ جیتنا یہ بھی ہوں گی۔ جہاں نوب ویل لگا تھا
وہاں لوہے کی ایک مٹی میں سے پانی کی ایک موٹی وسار چڑھنے میں گر رہی تھی۔ ایک
آوی لنگوٹا باندھے جبک کر رہا تھا۔ دو سرا آوی پھرتے پر بیٹھا مکا چوس رہا تھا۔
دور پہل کے درخت تلے ایک الکاؤ میں سے دھواں اٹھ اٹھ کر فضا میں پھیل رہا تھا۔
نوب ویل کا پانی جس ٹائے میں سے ہو کر کھینٹوں میں جا رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ
گینڈے کے پودے لگے تھے۔ یہ پودے گہری اور نیچے ایسے بنتی رنگ کے گینڈے
کے پھولوں سے لیسے پھلتے تھے۔ کثیر ان پھولوں کو دیکھ ہوا آگے گزر گیا۔ اس کا
پاؤں ایک جگہ پھسلا اور اس کے پاؤں پر تھوڑا سا کچڑ لگ گیا۔ کثیر ایک پھولی سی
لمبکی کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔ یہ لمبکی سچ گلاب کے پھولوں کی تھی۔ کھانے پینے کی
جڑوں کے ساتھ ساتھ اب پھولوں میں بھی ملاوت ہونے لگی تھی۔ گلاب کے پھول
اس ملاوت کا زیادہ شکار ہوتے تھے۔ ان کی تو کل ہی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ
چمکے اور خوش رنگ ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں خوشبو مستند ہو گئی تھی۔ یا اگر
خوشبو آتی بھی تھی تو اتنی کمزور اس کی چیزوں پر غلطی دلایا ہو۔ مگر اس لمبکی میں
اصلی اور نیچے گلاب کے پھول بکھر رہے تھے۔ پیاز کی رنگ کے پوری کھلی ہوئی
ہتھکڑیوں والے پھول نہ ہنسنے سے ہمیں بھیبتی شیریں منک اٹھ رہی تھی۔ ان پھولوں
پر بہنوئے ملتا رہے تھے۔ اس لمبکی کے گرد خاردار جمالیوں کی باز لگا دی گئی تھی۔
کیونکہ یہ پھول سمندر ہانے کے کام آتے تھے۔

کبیر کتنی ہی دیر اسن بھیتی کے پاس کھڑا کھاب کے پھولوں کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنے قلب میں گہرے سکون اور الطیبین اور سہرت کی لہروں کی محسوس ہو رہی تھی۔ توڑی دیر بعد اسے ہوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی کھاب کا ایک پودا ہے۔ اسے اپنے جسم پر کانٹوں، پتوں، پھول کی ہتھکڑیوں، شبنم، کڑی کے جالوں اور کھاب کی کمری کمری خوشبو کی اٹھتی ہوئی لہروں کا احساس ہوا۔ تین چار تین نوکریاں اٹھاتے بکھیت میں داخل ہوئیں اور پھول چنے لگیں۔ جنب شام کو یہ سارے پھول چن لیں گی تو ان کے پھولوں اور پتیوں سے کھاب کی خوشبو اڑی ہوگی!

ایک عورت نے کبیر کو دیکھا اور پھر ذرا مسکرا کر دوسری عورت سے بات کرنے لگی کبیر وہاں سے ہٹ گیا اور کھیتیں کھیت ہو کر واپس روانہ ہو گیا۔ کچھ کانٹیں

اور بیٹھیں کلاہ کے گیت کے ساتھ کھڑیں خٹم اور گوجی کے منٹے میں ڈھل کھا رہی تھیں۔ کبیر جب وہیں سے گذرا تو ایک بیٹھیں نے منہ میں بڑا سا خٹم چباتے ہوئے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کبیر آواز سا مسکرایا اور اس نے یوں منہ ہٹایا جیسے بیٹھیں کا پورے لے رہا ہو۔ بیٹھیں بھی مسکرائی جو کی اور جھڑپائی جو کی۔ لیکن بیٹھیں کی مسکراہٹ اور شریطے پن کو دیکھنے کے لئے انسان کے اندر جینے کا ہونا ضروری ہے۔ اور کبیر نے اس شرم کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ ایک گڈا کبیر کے آگے آگے جا رہا تھا۔ اس پر گاڑیں لدی ہوئی تھیں۔ کبیر جب اس کے پاس سے گذرنے لگا تو اس نے ہڈی سے ہڈی سے ہاتھ پھٹا کر چند سات گاڑیں اٹھا کر اور کوٹ کی جیب میں بھر لیں اور ایک گاڑی کو دانتوں سے تاز کر پڑے۔ جڑے سے کھانا آگے چل رہا۔ گاڑی مٹی تھی۔ کبیر نے چھائی والے سے خرید کر بھی گاڑیں کھائی تھیں۔ مگر اسے اتنا مزہ بھی نہیں آیا تھا۔ دن پورے سے لگتے لگتے اس نے رسائی گاڑیں ختم کر لیں۔ صبحی شاہ کے محل کے چپے سے نکل کر کبیر نے بس پکڑی اور راز محل پارک میں آگیا۔ راج محل پارک کے پوتلوں میں، علمی لوگ بیٹھے برقی گرم پاؤں کر رہے تھے۔ کہیں بیٹھ بیٹھ کا شوقین چہرے کے تاثرات سے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں کوئی گرم ہانپنے کی دھن میں فائبر کو اپنی ہاتھ کے پتھر میں چاٹنے کی فکر میں تھا۔ ان پوتلوں میں عام طور پر ایسے عناصر آتے تھے جن کی جھینگی خالی گردنیں وعدوں سے لبریز ہوتی تھیں۔ ایسے فانی جوانے آتے جو مچھل اس امید میں سلواؤز کے پتھر لٹ رہے تھے کہ ایک نہ ایک بدتر انہیں ضرور بیٹھ بننے کا چانس مل جائے گا۔

کیر ایک عمارت کی تیری حلقہ پر ایک جگہ سے کمرے، بین داخل ہو گیا۔ یہاں اس کا ایک علمی دوست جو کہ قطعی شاعر تھا وہی شراب کا اوجھا سانسے رکھے ایک علم کے گیت گئے میں بیوقوف تھا۔ کیر کو اور آواز دیکھ کر اس نے ایک نغمہ لگایا۔

کیرے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”میں عین وقت پر پہنچے آتا ہوں۔“

۱۸. تم کہنے سے۔

—”میں میں کیا شک ہے۔“

”یک پتہ برسہ صبح گھنٹی“

”بھئی شاعر نے ہاتھ ہلا کر کہا۔“
”ابو اس مذکر باب امرتسری۔ میں تو جیڑا ہی رہا ہوں ابھی کہ میرے سر پر وہ ماروں گا۔ میں میرا اپنا کھیل رہا ہوں۔“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل۔“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“

”باب نے میرے ہاتھ ہلا کر کہا۔“
”ابو اس مذکر باب امرتسری۔ میں تو جیڑا ہی رہا ہوں ابھی کہ میرے سر پر وہ ماروں گا۔ میں میرا اپنا کھیل رہا ہوں۔“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“

”ابو اس مذکر باب امرتسری۔ میں تو جیڑا ہی رہا ہوں ابھی کہ میرے سر پر وہ ماروں گا۔ میں میرا اپنا کھیل رہا ہوں۔“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“

”ابو اس مذکر باب امرتسری۔ میں تو جیڑا ہی رہا ہوں ابھی کہ میرے سر پر وہ ماروں گا۔ میں میرا اپنا کھیل رہا ہوں۔“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“
”کوئی کھیل؟“

(۳)

”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“

”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“

”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“

”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“
”نہن نے آخر ایک سکول کا کھوج لگا لیا۔“
”ابو اس سکول میں لڑکیوں کو سیتا رہا تھا۔“

[illegible]

اگلے روز زقون و شکاری کے ایک اور سکول لیا، بیٹھی وہاں بھی وہی حالت تھی آہستہ بہی استی نے بغیر کسی حیات کے اسے سکول میں لینے سے انکار کر دیا۔ زقون پامید ہو کر باہر آگئی اور سونگ کے کنارے ایک طرف کو میل پڑی۔ پرانی اندر کی سے ہو کر وہ خوشی مارکتی کی طرف آ رہی تھی کہ اسے کبیر نظر آیا۔ وہ فٹ پاٹھ پر دونوں پاٹھ چٹان کی جھیل میں والے بڑے بڑے ٹکڑے بچھا جا رہا تھا۔ زقون کے چہرے پر حکمرانیت آگئی اسے یوں لگا جیسے سارا شہر اس کا اپنا ہے۔ اور بڑا آدمی اس کا دوست ہے۔ اور اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ اپنی ناکامی کا سارا غم بھول گئی۔ اس نے قریب جا کر کبیر کو بلا لیا۔ کبیر رک گیا۔ زقون نے قریب الٹ دیا۔

”کو تو تن کیا حال ہے؟“ اور کہاں سے آ رہی ہو؟“۔ یہ سب
 زنون نے سبکراتے ہوئے کہا۔ ”اے اے (عزیز) زنون! میں نے
 ”تم کہاں گھوم رہے ہو۔ کیا لاٹھری لگنے سے؟“۔
 ”کچھ نے مزہ لیا تھا پھر کر کہاں۔“۔

زخون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن میں بس بھیجی۔ زخون اس میں سوار ہو گئی۔ بس سمن آباد کی طرف چل چڑی۔ چپے وہ بسن آباد کے طالب پر اتری تو ایسے معلوم ہوا کہ وہی لڑکا بدستور اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ زخون نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی اس کے گھر کا علم ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس اپنی سے ہمیں پتہ لیتے چاہئے۔ چنانچہ وہ رک گئی۔ سواری کوٹ والا جب اس کے قریب آ گیا تو زخون نے کہا۔
 "آپ کس لئے میرا پیچھا کر رہے ہیں؟"
 سواری کوٹ والا مسکرا کر بولا۔
 "میں چاہتا ہے۔"
 اگر شرم کی وہ بری سڑک پر اسی طرح کوئی شخص آپ کی منی کا تعاقب کر رہا ہو تو آپ گوارا کریں گے؟
 سواری کوٹ والے نے سہرٹ نکال کر کہا۔
 "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتا۔"
 زخون نے ہلانے سے ایک سیٹھل اتار کر سواری کوٹ والے کے سر پر لپکا۔
 نے مارے ہوئے کہا۔
 "آپ میرا پیچھا کیوں کر کر رہے ہیں؟"
 سواری کوٹ والا ہکا بکا رہ گیا۔ اتفاق سے اس سڑک پر اور کوئی نہیں تھا۔ سواری کوٹ والے نے جیب سے عدال لیکر سر پر لپکا اور جیسے میں بولا۔
 "آپ بڑی تدبیر ہیں۔"
 زخون نے دوسری بار سیٹھل اٹھایا ہی تھا کہ سواری کوٹ والا وہاں سے ٹوڑ گیا۔
 زخون نے خدا کا شکر ادا کیا اور شاہد کے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔
 جہاں اس نے سواری کوٹ والے کے سر پر بڑھایا تھا اس جگہ سڑک پر ساتھ ہی ایک بڑی بھری کھادنی میں گلاب کے کچھ پھول رکھے ہوئے تھے۔ پتیلی اور گرم دھوپ میں ان پھولوں کی ٹانگہ اور روشنی کے پتھر ٹان پوری ہو گئی تھی۔
 پھولوں نے بھی زخون کو سواری کوٹ والے کے سر پر جوئی یاد دے دیکھا تھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ انہوں نے نہ تو سواری کوٹ والے سے کچھ کہا اور نہ زخون سے شکایت کی۔ کیونکہ پھول محبت اور خاموشی کا مظہر ہے۔ وہ نہ زخون میں گروہ پد کی

[illegible]

"میں! ہنر کے دفتر میں ایک بار مستری ہے اس نے کیا کیا؟"
 دو دو نوں فٹ پانچ سو ساٹھ ساٹھ چلے گئے۔ نقون نے کہا۔
 "ہائے بھگت؟"
 "میرے پاس آؤ می ڈی سکرٹ اور پچ آئے ہیں۔"
 نقون مسکرائی اور بولی۔ "اگر یہ کہو۔ میرے پاس پیسے ہیں۔"
 دونوں نے غور سے دیکھا۔ ایک ہوٹل کے کچن میں جا کر بیٹھ گئے۔
 پوری آہستہ سے سوچ رہی تھی کہ کیا کیا اور پیسے میں قمری رنگ کو ملے گا۔
 ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے زمین سے بیٹھا سکرٹ لی رہا تھا۔ وہ بھی کچن کی
 طرف دیکھ کر ہلے سے مسکرا رہا تھا۔ نقون اس انتظار میں رہی کہ وہ اس سے
 پوچھے کہ وہ آج کل کیا کر رہی ہے۔ اور کہاں رہتی ہے؟ مگر کچر نے اس حیرانگی
 بھی سوال نہ کیا۔ آخر نقون نے نہ رہا کیا اس لیے غور سے دیکھا اور بولی۔
 "دیکھو! وہ ڈال۔" موزوں اپنی کمانی پہنائے کو بیٹھ جا رہی ہیں۔
 "کچر نے سکرٹ کو اٹھایا۔ وہ بیٹھ رہی تھی۔ نقون کی داستان کا
 ایک ایک لفظ سن کر نقون بڑی حیران ہوئی کہ اس شخص نے اپنی طرف سے کچر پوچھے
 کی دہائی بھی غور سے دیکھی تھی اور اب کچر نے غور سے اس کی باتیں سن رہی
 تھیں۔ نقون زیادہ پریشان نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ کچر کی عجیب و غریب شخصیت سے کچر
 متاثر ہو چکی تھی۔ جب نقون نے اپنی بات سمجھ کر لی تو کچر نے اس کی بات
 جاننے لگا۔
 "جیسے ایک ایسا مرض ہو گیا ہے جس کا وہاں علاج شادی ہے۔ تم شادی
 کیوں نہیں کرتیں؟"
 نقون کو کچر کے ہنر سے شادی کا لفظ کچر عجیب سا لگا۔ اس نے اس سے
 کہا۔
 "مجھ سے کون شادی کرے گا؟"
 "کوئی نہ کوئی یہ قوف بن سکتا ہے۔"
 "میں یہ قوف سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"
 کچر نے سکرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔
 "تم نے دو بار حملوں سے شادی کی اور اینٹوں نے دونوں دفعہ تمہیں آگے

"اگر اسے میری گزشتہ زندگی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو کیا وہ مجھے گھر میں بٹائے رکھے گا؟"

"میرا خیال ہے وہ تجھیں گھر سے باہر نہیں نکالے گا۔ کیونکہ جہاں تک میں اسے جانتا ہوں۔ وہ یہ قوف ہے اور یہ قوف آدمی سنگدل نہیں ہوا کرتے۔ ہماری دنیا کا سارا علم اور نا انسانی محسوسوں کی پیداوار ہے اور میرا یہ سسٹری کم حمل ہے۔ بلکہ بے حمل ہے اور اس وقت اس سے کوئی بھی عورت شادی کرنے کو چاہے نہیں۔ وہ تم سے بڑی محبت کرے گا۔"

زینون نے غور سے سمجھ لیا۔

"ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ شادی کی پہلی رات کچھ اور ہوتے ہیں اور ایک سال بعد کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب اسے میری پہلی زندگی کی تصویر کا علم ہو جائے تو وہ بھی مجھے ٹھوکر مار کر گھر سے باہر نکل دے۔ پھر میرے لئے کوئی ٹھکانہ نہ ہو گا۔"

کیر نے دو سری پٹائی کے آخری قطارے ملحق میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"ہو سکتا ہے وہ بھی ایسا ہی کرے۔ کیونکہ حمل روز بروز ترقی کر رہی ہے اور ہر بے حمل عورت ہونا چاہتا رہا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سسٹری ایسا نہیں کئے گا۔ کیونکہ وہ اتنا بے وقوف ہے کہ کوئی اس سے حمل بھی نہیں لے سکتا۔"

"نہیں یہ غلطوہ مول لینے کے لئے چاہے نہیں ہو۔"

"تو پھر دوسرے خطرے مول لینے کے لئے تجھیں تیار رہنا چاہئے۔"

زینون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور وہ اس ہو گئی۔

کیر نے سگریٹ جلایا اور اس کے جڑے جڑے کش لینے لگا۔ پھر بولا۔
"اگر میں تمہارا بوجھ اٹھا سکتا تو میں خود تم سے شادی کر لیتا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں تو شادی کے بعد میرا بوجھ بھی تجھیں ہی اٹھانا پڑے گا۔"

زینون کے چہرے پر ایک بار امید کی کرنل سی چلی۔ اس نے کیر کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔
"کاش ایسا ہو سکتا۔"

کیر نے سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر کہا۔

"لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

زینون نے کہا۔

"اگر میں تمہارا بوجھ اٹھائے تو تیار ہو جاؤں تو؟"

کیر مسکرایا۔

"کیسی بچوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میرے ساتھ تم بھی بھوکوں مرنے میں ایک بے گناہ عورت کو اپنی پریشانیوں اور ترسوں میں شریک نہیں کر سکتا۔"

"ہم دونوں کوئی کام ڈھونڈ لیں گے اور یہی لگا کر محنت کریں گے۔"

"میں کام کے سخت مخالف ہوں۔"

"کیوں؟"

"کام غیر قدرتی فعل ہے۔"

"مگر شادی کے بعد اگر تمہارا بہت کام کرنا پڑے تو کیا حق ہے؟"

"اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔"

"تم بیکے جیب و غریب ہو۔"

"صرف جیب ہوں۔ غریب نہیں ہوں۔"

کیس میں ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔ کیر چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیٹ رہا اور زینون اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کہیں نہ کہیں نوکری تلاش کرے گی اور باقی ماندہ زندگی محنت مزدوری کر کے شرافت سے بسر کر دے گی اور کسی مرد کے ساتھ شادی کر کے کسی قسم کی چابی کا غلطوہ نہیں مولے گی۔ اس نے کیر سے اپنے اس فیصلے کا ذکر کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

"تم شادی کے بغیر گزارہ کر سکتی ہو۔ لیکن مرد کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتیں۔"

"یہ میں بعد میں سوچ لوں گی۔"

کیر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"بہت خوب۔۔۔ میں بعد میں سوچنے والوں کی قدر کرتا ہوں کیونکہ بعد میں سوچنے والے یہ قوف ہوتے ہیں اور دنیا کو اس وقت یہ قوفوں کی ضرورت ہے۔ چلو اب چلیں اور جتنی بھی ہو سکے اس دنیا میں یہ قوفی پیدا کریں۔"

زینون ڈرا سی مسکرائی۔ کیر نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہارے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ہے۔ یہ یقینی طور پر ہے۔"
اسنے میں ہراساں لے آیا۔ نقون نے غی ادا کیا اور وہ دونوں کیمین سے اٹھ کر
باہر آ گئے۔ پونہ دسی کے بس شاپ پر آ کر نقون بس میں سوار ہوئے مگر اس نے
پوچھا۔

"پھر کب ملاقات ہوگی؟"
"رات کو بارہ بجے کے بعد میرا روانہ ہر آوی پر نکلا ہے۔"
اتنا کہہ کر کبیر نے سگریٹ پیٹک دوٹوں ہاتھ چھوٹ کی بیویوں میں ڈالنے اور
بڑے مزے سے ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

کبیر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتا جب میزبان ہوٹل کے پاس آیا تو اس نے
دیکھا کہ ایک آدمی ہوٹل کی میزبانی پر پانی سے بھرا ہوئے گزروں میں گھاپ اور
نرس کے پھول رکھے بیٹھا ہے۔ کبیر اس آدمی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ نرس کے
کھلے ہوئے پھول دیکھ کر مسکرائے۔ پھول اندر سے ہوتے ہیں لیکن وہ آنکھوں والے
بے لڑاؤ دیکھتے ہیں۔ کبیر کے رنگ ویر پٹے میں نرس کے پھولوں کی دھیمی دھیمی میٹھی
میٹھی مہک بھلے گئی۔ اس نے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ پھول پیچھے
والے نے آج تک ایسا کاجب نہیں دیکھا تھا۔ کبیر نے آنکھیں کھولیں تو اس کا چہرہ
گھاپ کے پھول کی طرح ترنہ ہوا اور سرووں کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس نے
چار آنے کے نرس کے چار پھول لئے اور بیٹن روڈ کی طرف آگیا۔ بیٹن روڈ پر
نرسک کا شور اور دنگ دیکھ کر نرس کے پھول پریشان سے ہو گئے۔ کبیر نے پھولوں کو
چونچے کر لیا۔

وہ داخل پارک کے دھواڑے اپنے ایک قلبی اخبار نویس دوست کے دفتر میں
آگیا۔ یہاں رباب امرتسی بھی بیٹھا تھا۔ اس نے کبیر کو دیکھ کر غصہ لگایا
"آگیا میرا بھگت کبیر؟"

اور جب اس نے کبیر کے ہاتھ میں نرس کے پھول دیکھے تو چی مار کر بولا۔

"تو نرس کے پھول! کبیری نرس کے پھول لا سکتا ہے۔"

کبیر نے صوبے پر ہنسنے لگا۔
"بھلا اس بد کوہ۔ تم کو بھی کے پھول ہو۔ حسین نرس کے پھولوں سے کیا لگاؤ
وہ بیٹھا اپنے بٹر کمان ہے؟"

رباب امرتسی نے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

"خبر ہے؟"

رباب امرتسی کا سرخ و سپید چہرہ مزید سرخ ہو گیا اور وہ جھٹکا کر بولا۔

"سوکھ کر رہا ہے۔"

اب میں کہہ رہی تھی کہ اس کے جین کس کے آگے بھاؤں گا؟
 کیر نے نرمی کے پھولوں کو بنا کر دے دیے تھے۔
 ”تم اپنی تصویر کے سامنے بیٹھ کر۔ رہا اب امرتسری کے سامنے بیٹھ کر میں جا
 سکتے ہو۔ مگر نرمی کے پھولوں کے کوٹھے میں رہا سکتے۔“
 رہا اب امرتسری نے جیب میں سے گوارڈ نکال کر اس کی پستلی لینے ہوئے کہا۔
 ”میں نہیں نہیں ہوں۔ میں تو حق کے جنگ کا ایک بہن ہوں۔“
 ایڈیٹر نے کہا۔
 ”تم کہہ رہے ہو۔“

کیر نے دو قول ہاتھ اٹھا کر کہا۔
 گدھے کی توجہ مت کہہ بیٹھے ایڈیٹر۔ گدھا وہیلوں کی سواری رہا ہے۔
 گدھا مقدس جانور ہے۔ گدھا ہے وقف ہے اور ہمیں ہے وقوف کی ضرورت
 ہے۔“

رہا اب امرتسری نے ہاتھ ہوا میں لڑا کر کہا۔
 ”میں یہ قول کا جام صحت پیتا ہوں۔ زندہ ہوں۔ یہ وقت لوگ!“
 ”زندہ ہوں۔ یہ وقت۔“

کیر نے ایڈیٹر کا ہاتھ اٹھا کر کہا۔
 ”تم بھی ہاتھ اوپر اٹھا بیٹھے! تمہارا جام صحت بڑا جا رہا ہے۔“

ایڈیٹر ایڈیٹر ہوا خوش ہوا اور اس نے دو قول ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ رہا اب امرتسری
 نے جیب سے روپے نکال کر بیڑہ رکھ دیے۔

”گور شراب منگاؤ کیونکہ!۔۔۔ آج میری گرہوں پر چمڑی چلاؤ۔ آج میں ایک
 ہڈی سر کی گرہوں پر چمڑی چا کر گیا ہوں۔“

کیر نے روپے لے کر چڑھائی کو آواز دی۔
 ”جمہوریت ڈاکو! لاش میں حاضر ہو جاؤ۔“

بھرت ڈاکو یعنی چڑھائی فوراً آگیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہاں شراب آگئی اور وہ
 تینوں کی کر جام لڑھاٹے لگے۔ وہ شام تک بیٹھے وہاں شراب پیتے اور اودھم مچاتے
 رہے۔ ابھی بول خالی نہیں ہوئی تھی کہ ایڈیٹر کی فوجی کالی محبوبہ آگئی۔ آستے میں
 دو واڑہ کھلا اور ایڈیٹر کی ایک پرانی محبوبہ اندر آگئی۔ ایڈیٹر نے اپنی کالی محبوبہ کو یقین

اور پھر پٹنے سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اندر اس کی کالی موٹی
 بیٹیس نما محبوبہ آئی ہوئی ہے۔ اور وہ اس سے محبت کر رہا ہے۔ کیر نے نرمی کے
 پھول میز پر رکھے اور رہا اب امرتسری کے ساتھ بندہ دوڑانے کے سوراخوں میں
 جھانکنے لگا۔ رہا اب امرتسری کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا اور وہ تیر سانس لے رہا
 تھا۔ کیر پلٹ کر صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے رہا اب امرتسری کو بھی کھینچ کر صوفے
 پر بٹھالایا۔

آستے میں بیٹھنا ایڈیٹر اور اس کی موٹی محبوبہ باہر آ گئے۔
 ”آؤ بھلت کیری آؤ!“

موٹی محبوبہ نے کیر کو سلام کیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاتھ پر تھکے ہوئے
 ہاتھوں کو ٹھیک کیا اور پھر کیری کی طرف دیکھ کر بیٹیس کی طرح سگڑا لے گئی۔ ایڈیٹر نے
 میز پر نرمی کے پھول دیکھ کر کہا۔
 ”یہ پھول کہاں سے آگئے؟ ضرور بھلت کیر لایا ہو گا۔“

موٹی اور آستے چمک کر بولی۔
 ہاتھ نرمی کے پھول کتنے یاد دہش ہیں۔ میں تو سب نرمی کو کھینچ کر لے گئی۔“

ایڈیٹر نے موٹی عورت کی گردن پر مکا مار کر کہا۔
 ”آج مجھے نہ کوٹھنے نہ لگانے ہاں میں۔“

”ہاتھ ہاتھ کوٹھنے کے لئے میں ہی رہ گئی ہوں کیا؟“
 موٹی عورت نے نرمی کے پھول اپنے چوڑے شستوں کے پاس لے جا کر اس

دور سے اوپر سانس کھینچا کہ پھول کی تارک چٹاں کاپنے لگیں۔ کیر نے آگے پیچ کر
 پھول چھین لئے۔

”ہاتھ کیری! میں تو نرمی کی عاشق ہوں۔“
 ”تم ایک بیٹیس ہو۔ ڈگر ہو! تمہیں ٹائڈے کھانے چاہئیں۔ کوٹھو کھانے

چاہئیں۔ نرمی کے پھولوں نے تمہارا کیا بکاڑا ہے؟“
 رہا اب امرتسری پر ہنسی کا دودھ چڑ گیا۔ موٹی محبوبہ ناراض ہو کر اٹھی اور اپنے

ایڈیٹر بیٹیس کی گردن پر زور وار مکا مار کر ڈبل سٹائی باہر نکل گئی۔ بیٹیس ایڈیٹر نے
 سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

”ہاتھ تم لوگوں نے مجھ سے میری محبوبہ کو جدا کر دیا۔ وہ ناراض ہو گئی ہے۔“

ہاتھوں کی طرح بڑبڑا کر کہہ کرے میں پھر کانٹے لگانے سے روکتا ہوں۔
 "تم میرا جیڑا غرق کرنے کے جی رہو گی۔ اب اس دفتر کا نظام اٹھے گا۔
 میرا کاروبار چار ہو گیا میں میرا چھو گیا۔
 "موتی عورت نے ایڈیٹر کو گریوٹی سے روک لیا۔
 "یاد رہے لگنے سے مل رہی ہیں۔ میرے دل پہ لگا رہا۔ آج تو میں نے معاف کر
 دیا۔ کل اگر یہ اس دفتر میں آتی تو میں اس کی آہستہ آہستہ باہر نکل دیتا۔ میں بھی
 چاہتی تھی کہ وہ یہی ہو جاتی ہو۔ ہاں سچ۔ سچ ہے۔
 "اتنا کہہ کر اس نے ہر دو اوزار اور ٹیلر شیفٹی باہر نکل گئی۔ موتی کو ابھی
 تک ہوش نہیں آیا تھا۔ بھوت ڈاکو نے اس کے ہوتے آثار دیکھ کر گولی نہیں منٹ
 کے بعد عورت کو ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔
 "کیا ہوا تھا؟"

ایڈیٹر نے فیسے میں آکر کہا۔
 "حاضر! تم میرا دل لے لیں کر رہو گی۔ میں تو جی جی دفتر پر گناہ لگا کر رہی ہو
 رہا ہوں۔ نہ رہے گا ہاں نہ بچے گی ہانسی۔"
 کبیر نے محسوس کیا کہ اب کھیل ختم ہو گیا ہے اور اس سے زیادہ دلچسپ ڈرامہ
 ایب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ رہاب امرتسی کے ساتھ دفتر سے باہر نکل آیا۔
 وہ اُسے جتنے ایڈیٹر کی گالیاں ان دنوں کا تعاقب کرتی رہیں۔ کبیر کو اس بنیادی
 فحش لڑائی کے دوران جس جہنم سے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فحش کی خوشبو تھی۔
 جتنی دیر گھر سے عورتوں کی جنگ ہوتی رہی تھا جس کے عطر کی تیز خوشبو پھیلی
 رہتی۔ وہ اصل وہ فحش عورتیں جس کا کلی میٹر لگا کر گئی تھیں۔ لڑائی ہوتی تو فحش کی منک
 مزید اڑنے لگی۔ عورتوں کی غصہ ناک چہرے پہنے ہوئے کپڑے پہننے کے۔ ہاتھوں
 میں اٹھے ہوئے برسات کے پانی۔ تیز تیز ہائیں اٹھاتی گدی گالیاں اور خفا کے عطر کی
 خوشبو! جتنی دیر کبیر صبر بھرا دونوں عورتوں کی جنگ دیکھ رہا تھا اسے یوں محسوس ہوتا
 تھا جیسے وہ کسی دھڑکنے والے جگہ عورتوں میں بیٹھا ہے۔ یہ سب کچھ شادی کا ماحول ہی تو
 تھا۔ خفا کی خوشبو تو ہی چوڑیاں لٹکے ہال۔ پہنے گریبان۔ باقی رہا ہمیں لکھنے سے ہی
 اور گالیاں تو یہ شادی کے بعد کی ہائیں تھیں۔ ہر حال میں ان کو بھی شادی سے ہی

دلا رکھا تھا۔ کہ وہ اپنی پرانی محبوبہ سے بالکل نہیں ملتا۔ اب جڑوہ اچانک اس کی ڈائریکٹر
 پریشان ہو گیا۔ ہمیشہ لپکا لپکا محبت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے پھر مار کر
 پوچھا۔

"تو یہاں کیا لینے آئی ہے حاضری؟"
 پرانی محبوبہ نے غور کر لیا۔
 "تمہی ماں کے پاس سے لئے آئی ہوں۔"

پرانی محبوبہ پورے احماد سے ہل رہی تھی۔ کیونکہ اس کو بھی ایڈیٹر نے جتنی دلا
 رکھا تھا۔ کہ وہ کل کلٹی محبوبہ سے بھی نہیں ملتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے چوری
 چھپے دونوں سے پارہ کر رکھا تھا۔ ہر قسم سے آج ان دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔
 رہاب امرتسی دور دار فتنہ لگا کر نہیں پڑا۔
 "کیا شاعری ہو رہی ہے۔"

موتی عورت نے نوادہ عورت کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ پرانی محبوبہ کچھ دلی تھی
 مگر اس میں پختہ اپنی طاقت اور پختہ تھی۔ اس پر پہلے میرے سے گھاس اٹھا کر موتی
 محبوبہ کے سر پر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ وہ جھلی کی طرح
 ٹپٹ میں آکر اٹھی اور اس سے ختم تھا ہو گئی۔ کبیر نے ہر گز نہ لپکا اور میرے جتن
 کر اس دلچسپ لڑائی کا تماشا دیکھنے لگا۔ رہاب امرتسی نے برق الہائی اور ایڈیٹر کو
 انہیں مار دیتے لگا۔

"ششماؤ عورت تو جانتے نہ پانتے آیا کھوڑا مارو کر باگ اڑ جائے۔"

ایڈیٹر کا فحش ہون ہو گیا۔ اس نے جی مار کر چڑائی سے کہا۔

"بھوتہ دفتر کے دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔ کوئی اندر نہ آسکے۔"

اور خود بھاڑ کرانے لگا۔ جب وہ دونوں کے درمیان میں کیا تو دونوں عورتوں
 نے بے حاشا اسے مارنا شروع کر دیا۔ ایڈیٹر کی طرح انہیں بڑے بڑے ہتھکڑ
 دونوں عورتیں ہر ایک دوسرے سے جھگڑتی ہوئی تھیں۔ قیصوں کے گریبان پھٹ
 گئے۔ دلی عورت کے بالوں کو موتی عورت نے پکڑ رکھا تھا اور اس کے سینے میں
 لائیں مار رہی تھی۔ اچانک دلی عورت فحش کھڑکیاں کر پڑی۔ موتی عورت نے ایسے
 فرش پر گر دیا۔ اور پھٹکارتی ہوئی اپنے بال درست کیے اور اسے گالیاں دیتے لگی۔
 رہاب امرتسی نے جلدی سے دلی عورت کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ایڈیٹر

دامن کشیں جو مگر اس معصوم لے کو بھول گئے ہو جب تم مجھے ہوئے مگر داخل ہوئے ہو اور تمہارا بچہ بھاگ کر تمہاری ٹانگوں سے پلٹ جاتا ہے۔"

کبیر نے سرگٹ کا کش اڑا کر کہا۔
 "یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں میں تم لوگوں کے لئے چھوڑتا ہوں۔ تمہاری مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی چائے کے برتن طشت میں رکھے تھی ہوئی سی پر پل رہا ہو۔ وہ تو کسی قدم پر بھی گر سکتا ہے۔ اور ان خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹپپے کے برتن تجھے بھگتے ہو سکتے ہیں۔ میں نے تو بیش ایک اعلیٰ اور ناقابلِ شکست مسرت کا خواب دیکھا ہے۔ ایسی مسرت جو حواہی لذت کے طوفان میں چٹان کی طرح سینہ ٹانے کھڑی رہتی ہے اور اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہل سکتی۔"

"تم ایسے بڑے معاشرے میں رہ کر اپنے آپ کو الگ تھلک کیونکر رکھ سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے کسی فعل کا براہِ راست یا بالواسطہ ادارے معاشرے پر اثر نہیں پڑتا یا بازارِ معاشرہ اپنے افعال سے تمہاری شخصیت کو متاثر نہیں کر رہا۔ نہیں نہیں کبیر تم اس طرح نہیں سوچ سکتے۔ اگر تمہاری طرح ہر کوئی سوچنے لگے۔ تو یہ معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے۔ اور ہماری ایک بھی اخلاقی قدر سلامت نہ رہے۔"

"ہر آدمی اس طرح نہیں سوچ سکتا۔ میری طرح سوچنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔"

"ملک ہے چین برائی اپنی کم سے کم حیثیت میں بھی برائی ہی ہوتی ہے۔ تخریبِ تخریب ہی ہوگی۔ خواہ ایک شہر چاہے وہی خواہ کسی مکان کی دیوار گرا دیں۔"

کبیر نے جھنجھلا کر کہا۔
 "تم امرتسر کے بچے فروش ہو۔ ہرگز کھا کر پیٹ پر ہاتھ پیرنے والوں میں سے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہ دور مکافوں کی دوا میں گرانے کا دور ہے۔ شہروں کو نیست و نابود کرنے کا دور ہے۔ طبہ ہر طرف طبہ ہی طبہ۔ تاکہ بالکل نئے کشادہ ہوا دار اور صاف ستھرے صحت مند مکانات کی بنیادیں کھڑی کی جا سکیں۔ تمہاری ہزار سالہ اخلاقی قدروں نے انسانیت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ جس اخلاقی نے بھی انسان کو انسان سے بہرہ روی کی درس دیا تھا۔ اب لوگ اسی اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر ایک دوسرے کا گھا بٹ رہے ہیں۔"

دونوں میٹھو کے ایک دوسرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رہاب امرتسر کی جیب میں کچھ روپے تھے۔ انہوں نے وہیں کھانا کھایا۔ کافی پی اور سگریٹ سلگ کر باتیں کرتے گئے۔ شراب کا فخر اتر چکا تھا۔ صرف گرائی باقی تھی۔ رہاب امرتسر شادی شدہ تھا۔ اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ وہ اپنے بچوں کی باتیں کرنے لگا۔ کبیر غاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اگرچہ اسے رہاب امرتسر کے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رہاب کو اپنے بچوں کی تعریف کرنے کا مرض ہوتا ہے۔ ایک بات پر کبیر نے ہنسنے کی کا اعجاز کیا تو رہاب ہلکا۔

"سب تمہارے ہاں پہنچے ہوں گے۔ تو ہر بچوں کا۔ مگر تمہیں ان کی ہر بات اچھی لگا کرے گی۔"

کبیر نے منہ کھیر کر کہا۔

"میرے ہاں یہ نوبت نہیں آئے گی۔"

"کیوں؟ کیا تم بچے پیدا نہیں کرو گے؟"

"میں شادی ہی کے خلاف ہوں۔"

"گویا تم شادی نہیں کرو گے؟"

"بالکل نہیں۔ کیونکہ میری راستہ میں انسان شادی کے بعد اپنی قومی شخصیت کسی دوسرے کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو اس کی بقیہ قومی شخصیت مزید ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔"

"تو کیا تم آزاد تعلقات کے حق میں ہو؟"

"میں تو اس کے حق میں ہوں اور نہ اس کی مخالفت ہی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے جو کوئی ایسا کر سکتا ہے اور ایسا کرنے کے بعد اپنے خیمہ کو بٹھلے کر سکتا ہے اس کے لئے یہی اچھا ہے۔ یہ تو ایک انتہائی کمزوری دوا ہے۔ جو مریض اسے ملنے کے اندر انا کر ہضم نہیں کر سکتا اس کے لئے وہی سیدھی سادی زندگی ہی اچھی ہے۔ کہ شادی کی 'بچے پیدا کئے' ان کے بچھنبھوں میں اپنا سر سفید کیا اور بوڑھے ہو کر مر گئے۔"

"لیکن تم شادی شدہ زندگی کی دلچسپیوں اور مسرت سے بھرپور محبت کو کیسے بھٹا سکتے ہو! تم بچوں کے پیار ہو کر روئے اور چلانے کو سامنے رکھ کر گھریلو زندگی سے

وہ "کیف" اور "ظلمات" کے مقالات سے بہت پہلے بھارت چکا ہوتا تھا۔ باقی زبان کی موشگافیاں، اعتراضات کا لسانیات پر اور لسانیات کا نفسیات پر لسانیاتی نفسیات کا اعتراضات تاریخ پر اثر اور اس کی تحقیق و تدوین — یہ سب بے مغز بے دس اور مردہ باتیں ہیں۔ یہ وہ چھوڑے ہیں۔ جن کی مدد سے گڑے سروے اٹھائے جاتے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ مردہ جسموں کو حیل دینے والے ہوتے ہیں۔ ہماری اردو زبان زندہ ہے۔ اور ان خدمت کرنے والوں حیل دینے والوں کی کارستانیوں کے ہاتھوں زندہ ہے۔ اور جب تک اس زبان میں شعر کہنے والے، ناول لکھنے والے اور کہانیاں سناتے والے زندہ ہیں۔ یہ زندہ رہے گی۔

کیر نے پتا سکرٹ رکھنا ان میں مسل کر دو سرا سکرٹ ملکا لیا۔
دباب امرتسری نے جانی میں پتی ہوئی لٹری کی کافی لکھوت ملک میں اڈیلا اور مسکرا کر بولا۔

"لیکن کیر تم نے میری اصل بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میں وہیں آ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہمیں میرے گئے، مقروض اور بے عمل ہونے پر اعتراض ہے۔ میرے بھائی اول تو یہ میرے ذاتی فعل ہیں۔ میرا قرض خواہ صرف مجھے لگتا ہے۔ ہمیں نہیں۔ میرے کام نہ کرنے سے صرف مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اور میں بھی کبھی شراب پیتا ہوں تو اپنا بکر خراب کرنا ہوں تمہارا نہیں۔ پھر تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟"

دباب امرتسری نے ہنس کر کہا۔

"اگر معاملہ ہمیں تک رہتا تو میں بھی اعتراض نہ کرتا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ تم اپنے گئے ہیں۔ بھو کی زندگی اور اس سے حلقہ خیالات کا پرچار بھی کرتے ہو اور اس طرح ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اس کے کیرے یا کھوٹے ہونے کے بارے میں آواز بلند کر سکیں۔"

کیر نے ہنر پر مٹا مار کر کہا۔

"تو پھر تم بلا جنم میں۔ تم لوگ مجھ سے کیوں پوچھنے آتے ہو۔ میں نے اپنے خیالات کے پختہ نہیں چھوڑے۔ ان کی تبلیغ کے لئے کسی جگہ جلسہ نہیں کیا۔ تم پوچھتے ہو تو مجھے یہ باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ کیونکہ میں جموت نہیں بول سکتا۔"

دباب امرتسری نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا اور کیر کا ہاتھ سمجھ کر بولا۔

"دباب امرتسری نے سکرٹ سے سکرٹ چلا کر کہا۔
"تم سب کچھ ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اگر جیسے براد گئے تو مجھے ایک بات بتا دو۔ وہ یہ کہ کیا تم مجھے ہو کر تم گئے ہو کہ شادی نہ کر کے اور اپنے قرض خواہوں سے بھارت کر اس معاشرے کی کوئی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہو؟"

"کیر کے ہونٹوں پر ہلکا سا جھیم نمودار ہوا۔ اس نے ماتھے پر اٹلی پھیر کر کہا۔
"میری بات تو یہ ہے کہ میں خدمت کرنے والوں کے سخت مخالفت ہوں۔ چاہے وہ معاشرے کی خدمت کرنے والے ہوں۔ چاہے ادب کی اور چاہے انسانیت کی۔ یہ لوگ حقیقت میں مجھ سے بھی زیادہ مجھے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفتر میں کلرک بن کر کام تو نہیں کر سکتے اور کلروں کی خدمت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ دفتر کے کام سے بھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ کام بھی نہیں کرتے اور عوام قوم بھی کھلاتے ہیں۔ اوسب بن کر ناول، کہانی یا فلم نہیں لکھ سکتے۔ اور ناول بن کر ادب کی یا زبان کی خدمت کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ غیر حقیقی ہوتے ہیں اور خود غرض اور بغیر کسی کام کے شہرت اور ٹیک نامی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بلکہ انہی لوگ کام کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں۔ تو کون کو چاہئے کہ پہلے وہ اپنی خدمت کرنا سیکھیں۔ پہلے انہیں اپنے گھروں کی چار دیواری کو خواہوش اور دلربا بنانا چاہئے۔ اور اس آگے بعد دوسرے کے مکان کا "خدمت" کے نام پر دروازہ کھٹکنا چاہئے۔"

دباب بڑے غور سے کیر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے سکرٹ بھاڑ کر کہا۔

"لیکن کیر! کرم بخش نے جو اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ اس کو کبھی نہیں بھٹکا سکتے۔ انہوں نے ہماری زبان کو پا کا اور اور سلیس کیا ہے۔ اور اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے مسکو کبھی نہیں لکھی ہیں۔"

کیر نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی موجودہ ترقی دیکھ کر کرم بخش نے ہنر کرنا۔"

اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ اور کر دی ہے۔ تاج دیکھ کر کی وجہ سے ہمارے ہاں کا ایک عالم شہری بڑی، آسانی سے "کیف میں ڈوبی ہوئی تھی وہ ظلمات کی رات" کا رہا ہے۔ یہ وہ "کیف" کے معنی جانا ہے۔ اور "ظلمات" کے لئے، لیکن وہ جانتا ہے اور گائے جاتا ہے۔ کرم بخش اگر اپنے مضامین کے ذریعے اسے اردو سکھانا چاہے تو۔"

بہار کا موسم آگیا تھا۔
 یعنی مارچ ختم ہو رہا تھا۔ لارنس باغ میں سبزہ سبک دینے لگا تھا۔ درختوں سے
 پتی ہوتی پتلیں تو تازہ ہو گئی تھیں۔ اور ان کے ہرے ہرے لوزائیدہ پتے ٹل آئے
 تھے۔ درختوں نے خزاں کا درد لباس اتار کر بہار کا رنگین لباس اوڑھ لیا تھا۔ سبزے
 کی کیاڑیوں کے عقب میں کڑی قد آدم بھائیوں میں سب سے بڑے لال قرمزی چیلے
 چھلے اور سفید سفید پھول کھل گئے تھے۔ ان کے قریب سے گزرنے پر خوشبو سے
 مبالغہ مبالغہ ہو جاتا تھا۔ ہوا طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو سے بو جھل ہو رہی تھی۔
 کمرے میں چیلے آسمان کے نیچے باغ کی شگاف لہنا میں بھونے اور جھپٹاں اومر سے
 اومر اڑ کر اپنی غرقی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہم کے درختوں پر پور آگیا تھا اور ان کی
 چوں بھری شبنموں پر سے اس چھپے لگا تھا۔ دھرتی کے خزاں زرد جسم میں بہار کا گرم
 گفت اور زندگی سے بھرپور خون دوڑ گیا تھا۔ بل دوڑ اور بیکار روڑ کے کنارے والے
 درختوں نے ہرے ہرے ٹارک اور دھبے دھلائے اپنے چوں کا چولا پہن لیا تھا۔
 مچن آباد کی کوئلیوں کے انگوٹوں میں سبزے میں چوں پر مچی تھی۔ رنگ برنگ
 پھول مچن کی دیواروں کے اوپر سے سر لٹا لٹک کر پر آئے جانے والوں کو محبت اور
 بہار کا سہارا دے رہے تھے۔ نو چٹکیں سر دیوں میں پت بھڑ سے درختوں کی نیچے
 برگ شبنموں میں الجھ کر کھٹکتی تھی جس اب وہ نو دمیدہ چوں میں اس پری طرح چھٹ
 کی تھیں کہ کوئی ہنس سے بڑا کاہنہ بھی انہیں مچھ و سہام باہر نہیں نکال سکتا تھا۔
 جس جگہ کوئی سوکھا ٹکا بھی پڑا تھا اب وہاں سے گھاس کا خوش بوٹ پڑا تھا۔ دھوپ
 میں چھٹنے سے اب گرمی محسوس ہوتی تھی اور چھاؤں میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا
 اور گرم ہوا کر چلتی تھی اور اپنی بھولیوں میں پھولوں کے سبزے اور درختوں کے تنوں کی
 خوشبو بھر بھر لاتی تھی۔ ناشپاتی کے جن پتوں پر ذرا پہلے پھول آگئے تھے۔ ان کی
 شبنماں اب چوں سے بھر گئی تھیں اور ان میں چھوٹی چھوٹی ناشپاتیاں کھٹکتی تھیں۔
 بیٹے درختوں پر ابھی تک چھللی اور سفید پھول کھل رہے تھے۔ یہی حال آندو اور

آب الہ میرے جلت کیر۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔

آلوپے کے درختوں کا تھا۔ لوگٹ کے درختوں کا مٹھر بڑا دھڑلہ تھا۔ ان کے سرسٹے ہوئے لائے تھے بالکل نیچے کو جگمگاتے تھے۔ اور ان کی جگہ تازہ اور ہلکے سبزے تھے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح تن کر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ بالائیں۔ پیچا رنگ کی چھوٹی چھوٹی پتیوں سے لہ کی تھیں اور ان کی چھوٹی میں جھڑے ہوئے تھے جو کبھی براؤن تھے اب کھل سبز سیاہ ہو گئے تھے۔ پتیل کے نئے ٹوٹے کھلونے والے دھار ہوں کو دیکھ کر چڑھٹوٹی سے سرخ ہو جاتا تھا اور دانی بھیل کر بیٹے سے لہا جراتے۔ کوڑے لگے۔ تھانہ کسی ہے کارنگ ہلکا بھلی تھا تو کسی کا ہلکا سبزہ کوئی پورا پورا پتھر پڑا پوری طرح بھان ہو چکا تھا۔ کوئی ابھی اپنی والی پر ہونڈی بنا چکا تھا۔ قند اور کوئی بھار کی خوشبو اور گرم ہوا کے جالوں کے اثر سے آہستہ آہستہ اپنی تہ کھول رہا تھا۔ درانی ہوا۔ چٹائی تو یہ سارے بچے مل کر تھانیاں بھانے لگتے۔ جیسے جیسے بچے سے بھاری شادی کا جالوں گزر رہا ہوتا۔

ماری قند حضرت اور درانی کے قلموں کے گویا رہی تھی۔ لیکن نفعان اپنی زنجیلی شاہد کی۔ مری آباد والی کو بھی کے دران قہارے میں اواسٹا بھی تھی۔ وہ گندھیلے کی لہا سے لپٹا ایک سفید ٹوپی کو بھلی لپٹ کر ڈھکی رہی۔ اس کا سر بھلا ہوا تھا اور وہ بھلے۔ اٹھاک سے کلام کر رہی تھی۔ بھلی بھلی کی کا پروچا ہوا تھا۔ جالی میں تھنے روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھلی تھی اور کھلی کھلے کے بعد اب ساتھ والے والے کمرے میں چلے پڑا۔ شاہد ہو کر رہی تھی۔ تو کرائی تو بھری طرف والے آگرن کے بڑا کھنڈ میں تھی۔ پکارا تھا۔ کمرے کے چکر میں ڈال رہی تھی۔ باہر والی سڑک خالی تھی۔ کوئی بس گزر جاتی تو ہلکا ہلکا کر تو اسی گھوڑوں کے ساتھ اڑا کر کوئی کی طرف آتا دیکھائی دیتا۔ ساتتے والی کو بھی کے لائن میں کوئی بچہ تین پیران والی سائیکل چلا رہا تھا۔ سائیکل کے پیروں کی چڑچڑاہٹ بھانڈے نالی دے رہی تھی۔ کسی وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ٹالپا تھی تو پتھر میں کسی بچوں کے پاس کوئی دھڑلے میں آتا ہے۔ یہ آواز بڑی اواسٹا کر دینے والی تھی۔ نفعان کو بیٹے کی آغوشیں تھیں۔ وہ جینا لہ بھلے۔ سبیل رو کر کی کی تلاش کے بعد وہ ٹالپا ہو کر رہی تھی۔ اسے کسی بچہ بھانڈے کی تو کئی نہ ملی تھی۔ وہ ایک بھون پر اپنے نوکری کی پیش کش کی بھی گئی لیکن ایک تو کھانا آتی۔ کم چھوڑ کر بھول گئی۔ ان کے ہاتھ پورا ہو کر تھا۔ وہ سب کلام بھی نیم غلاموں ایسا تھا۔ اس کلام کا اتنے پہلے ہی جرات تھی۔ اور پھر وہ معمولی پڑھی لکھی تھی۔

یعنی صرف اردو پڑھ اور نوٹا پڑھ لکھ ہی سکتی تھی۔

اس دوران میں نفعان کو بڑوں کو فٹ پاتھوں کی سٹاپوں اور دھڑلے اور سکولوں کی ڈیڑھوں میں کئی اپنے لوگ۔ نے جنوں نے اس سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ اسے اچھی اچھی نوکریوں کا کالی دیا۔ اسے فلم سمیٹنے میں شامل ہو کر یہ کہیں بننے کے سبز باغ دکھائے مگر نفعان نے کسی کی طرف دھیان نہ دیا۔ کیونکہ وہ ان عمارتوں اور ٹوکیوں چھوڑنے سے اٹھتے ہوئے راستوں کی ٹوکریں کیا کر اس حال تک پہنچی تھی۔ وہ تو اب شادی کے نام سے کاپی لکھتی تھی۔ اس کے والی میں یہ نفعان چلے گیا تھا کہ اس سے بھر بھی شادی کرتے گا وہ یا تو اسے کسی وہ سڑک کے ہاتھوں افرات فرات کر دے گا اور یا کچھ عرصے کے بعد اسے بے عزت کر کے کھڑے کھڑے باہر کرے گا۔ اس کے باوجود وہ شادی کر کے اپنی باقی ٹالپا زندگی اپنے شریف گھریلو نوکری کی طرح بسر کرنا چاہتی تھی۔ مگر کھینے کا یہ ٹالپا وہ سوال تھا جس کا نفعان سے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دینا اسے سوائے دانش یا زندگی کے اور کسی شہیت سے قبول کرنے کو چاہ نہیں تھی اور نفعان اپنی اس شہیت کو پیش پیش کے لیے فراموش کر دیتا تھا تھی نوکری اسے نہیں مل رہی تھی۔ اگر ملتی بھی تھی تو ایسی کڑ جس میں رصرت۔ ٹالپا ہی کم تھیں تھی بلکہ اس کی عزت بھی بھولے تھیں تھی۔ ہر وہ ٹوکری کہ فرض کر لیا کہ اسے اچھی سی نوکری مل بھی جاتی ہے۔ تو وہ کیا ساری عمر نوکری ہی کرتی رہے گی؟ کیا وہ دن اس کی زندگی میں بھی طوع نہیں ہو گا۔ جب اس کی گلو میں اس کا ہاتھ سا پچھل دبا ہو گا اور اس کا غلام ان پر چکا ہے کی طرف دیکھ کر مسکرتا ہو گا؟ اچھی اس کی بوائی کا عروج تھا۔ اچھی تو وہ اپنی بوائی اور جسم کی تازگی سے اپنا بڑے والا غلام حاش کر سکتی تھی۔ چلچل چھ سال بعد جب اس کا بدن ٹالپا شروع ہو جائے گا۔ کینٹن پر ایک آدھ سفید بلی نمودار ہو جائے گا۔ اور رخصتوں کی کھٹکی سوکھنے لگے گی تو پھر وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ پھر تو شاید وہ بچہ بھی پیدا کرے کے لائق نہ رہے گی۔ پھر تو اس سے کوئی بھی شادی کرے پڑے گا۔ وہ کہہ رہی تھی وہ کی روٹھی باقی تھی۔ اچھی سوچ پوری طرح مغرب میں غروب نہیں ہوا تھا۔ نفعان اس روشنی میں شام ہونے سے پہلے پہلے اندر چلے سے پہلے پہلے اپنی زندگی کی جلی کو پالنا چاہتی تھی۔

اور یہ جلی بڑی سیدھی سادھی اور آسان تھی۔ یعنی ایک چھوٹا سا گھر۔ چوڑا

کچھ برتن۔ ایک غلام اور محسن میں کاندھ کے ٹکڑوں سے کھینچا ہوا بچہ۔ احمق
سیدھی اور آسان خیال اچھی دشوار گزار اور طویل اور بچہ بونگھی تھی کہ نینوں کے
کونوں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ اور جھکن سے چرو مر رہا گیا تھا۔
وہ دو تین روز سے شاہدہ کے پاس پڑی تھی۔ شاہدہ اس کا سارا بوجھ اٹھا رہی
تھی۔ اس کا طرز عمل نینوں سے بڑا اچھا تھا۔ اس انا ضرور تھا کہ وہ نینوں کو اپنی ڈگر
پر چلانے کے لیے وہ ایک بار کوشش کر چکی تھی۔ اور نینوں نے بڑی شائستگی سے
اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ لیکن شاہدہ نے اسے مجبور بائیں نہیں کیا تھا۔ چنانچہ
ایک رات شاہدہ کا ایک کارخانے دار دوست اس کے گھر آگیا۔ اس نے رات وہیں
گزاری۔ شاہدہ نے اس سے نینوں کا تعارف کرایا۔ کارخانے دار کا رنگ لوبہ کی
طرح ساڑھا تھا۔ ہلے مومے تھے۔ اور توبہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے طرح کھا رہا تھا اور
بے لگتی باتیں کئے جا رہا تھا۔ بار بار سگریٹ پیتا اور بار بار تھوکتا تھا۔ وہ گھبراہٹ سے
اور چہ بچوں کا باپ اور وہ بیویوں کا غلام تھا۔ اس نے نینوں کو لپٹائی ہوئی نگاہوں سے
دیکھا اور بولا۔

”غدا بری فکر سے بچانے آپ کی سبیلی تو بڑی ضرورت ہے۔“

نینوں کے نزدیک اس قسم کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی
میں اس قسم کے کوئی شغل ایسے لوگوں سے سن چکی تھی جو صرف رات کی راتیں اپنی
پر عاشق ہو کر صبح اسے بھول پایا کرتے تھے۔ نینوں نے اپنا بازو کھینچ لیا۔ وہ صحت کر
مومے پر بیٹھ گئی۔ دراصل شاہدہ بھی یہی چاہتی تھی کہ نینوں اس کے ساتھ مل کر کام
کریں اور یوں اس کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ وہ ایک انتہائی قیمتی اور جوان عورت کو گھر
میں بونجی بیکار بیٹھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ خود اسے مجبور کرنا چاہتی تھی۔
کارخانے دار نے مشروب سے بھرا ہوا گلاس نینوں کی طرف پھرایا۔ مگر نینوں نے
پینے سے انکار کر دیا۔ اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شاہدہ اپنے دوست کے ساتھ تھا کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ نینوں چنگ
پر لٹاف اٹھ کر شیم دروازہ ہو گئی۔ اور ایک قلمی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔
سردی بہت تھی اور رات بھی کافی گزر چکی تھی۔ اسے ساتھ والے کمرے سے بھی
کبھی شاہدہ کے قہقہے کی آواز نکلاں کی جھٹک اور بے جہم بھی کی آواز سنائی دے
جاتی تھی۔ نینوں پکے دل میں اس قسم کی غلی اور بے جا آواز ایک ہی کے لیے بھی

بائیں پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اس سمندر کی موجوں میں اچھی طرح تیر چکی تھی۔ وہ
اس پر ہوس کے شرکی گلی کوچوں کی بی بھر کر سیر کر چکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے
رہا۔ پڑھتی رہی۔ اور اپنی آئینہ زندگی کے پارے میں سوچتی رہی۔ وہ شاہدہ کی زندگی
پر سوائے افسوس کے اعتبار کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ
اس کی زندگی کا انجام خوفناک ہو گا۔ پھر وہ نہ گھر کی رہے گی اور نہ گھاٹ کی۔
مگر شاہدہ اپنی ڈگر پر اچھی آگے جا چکی تھی کہ نینوں کی آوازیں اس تک نہ پہنچ سکتی
تھیں۔ نینوں کو چند آبلے گئی۔ اس نے ٹھیل لپٹ کی حق محل کی اور منہ لٹاف کے
انداز کے کر سونگئی۔

چنانچہ رات کا کیا عمل ہو گا کہ نینوں کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا

جیسے کوئی اس کے گلے پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اندھیرا
تھا۔ اسے اپنے چہرے پر کسی کا بدنہ دار ہو چلا۔ اس نے ہلکی سی
ہاتھ پیٹا کر ٹھیل لپٹ بنا دیا۔ اس کے سامنے بھرا کارخانے دار چنگ پر بیٹھا اس کی
طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال لالہ ہو رہی تھیں۔ اور ہر کے مومے
پل سرکھٹوں کی طرح کھڑے تھے۔

”گپ یہاں سے چلے جائیں۔“

کارخانے دار نے چکی سے سگریٹ کا دھواں بھرا کر بھولنے ہوئے کہا۔

”میری بہان ہم تو تیرے عاشق ہیں عاشق۔“

نینوں نے غصے میں کہا۔

”میں شور مچا دوں گی۔“

کارخانے دار نے قسم لگائی۔

”شور مچا کر اپنا حق نقصان کو گی۔ ہمارا کیا جائے گا۔ ساتھ والے کمرے میں
اس گھر کی مالک سو رہی ہے۔ اس نے مجھے اجازت دے دی ہے۔“

نینوں نے چنگ پر سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر کارخانے دار نے اسے
پکڑ کر گرا لیا اور پھر پھیر مار کر فرمایا۔

”توڑا دی! دغی ہو کر شریف عورتوں کا روپ بھرتی ہے۔ کتنا! تو جس آدمی
کے گھر سے بھاگی ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے غم نے اس شر کے کونے کونے
میں تجھے حاش کر رہے ہیں۔ میں نے ذرا اسے اطلاع کر دی تو وہ ایک منٹ میں تجھے

یہاں سے تھنٹ کر نئے جائیں گے۔ اور اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیں گے جس سے تو ساری زندگی باہر نہ نکل سکے گی۔ یہاں آپ کیا چاہتی تھیں؟

نہن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی ساری طاقت اسے جواب دینے چلی۔ اس کے حلق میں آواز دبا کر رہ گئی۔ وہ حیران ہو گئی کہ اس کا رخاٹے دار کو اس کی پچھلی زندگی کے واقعات کا کیونکر علم ہوا۔ کیا شاید وہ اسے سب کچھ بتا دیا تھا؟ میں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا خیریت میں وہ سب کچھ بتا گئی ہو؟ تو کیا اس کی تلاش میں شائبہ پھر رہے ہیں۔ کیا وہ اسے پکڑ کر عریض کے لیے کالی کوٹھڑی میں بھیج دیں گے؟ میں نہیں وہ۔ شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے۔ جس کا ایک چھوٹا سا کچا آگن ہو۔ چولہا ہو۔ اور ایک معصوم بچہ کاندے کے ٹکڑوں سے کھیل رہا ہو۔

پچھلی زندگی کے ہولناک واقعات اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ وہ بیک بیک ماری ماری پھرنے لگی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں میوے کی پوری کی طرح پٹکتے اور پھر ہوس کا رکی ہوس کا ٹانٹہ پٹنے سے اس بھڑکے کارخانے دار کی آنکھوں کو ترجیح دیتی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ ان ٹکڑوں کے ہاتھ لگ گئی تو اسے بیک بیک لے پھرتے تھے۔ تو وہ اسے مار مار کر لوٹاؤں کر دیتی گئیں۔ اور پھر وہ ساری عمر ان کے پٹنے سے باہر نہ نکل سکے گی۔ چنانچہ نہن نے اپنا آپ کا رخاٹے دار کے حوالے کر دیا۔

دوسرے روز نہن بیمار پڑ گئی۔ اور وہ روز بیمار رہی۔ شاید وہ اس کی ہر طرح سے غمخواری کی۔ جب نہن نے اس سے گھر کیا کیا اس نے کارخانے دار کو اس کی گذشتہ زندگی سے آگاہ کیوں کیا تو شاید وہ اس کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

”نہن! میں تمہاری بھرم ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ اس روز میں نے اتنی پیاری تھی کہ مجھے اپنا ہی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ مجھ سے جو کچھ پوچھا گیا میں اسے بتاتی چلی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے تمہاری گذشتہ زندگی کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ لیکن یقین کرو میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنے کتے پر بے حد محبت ہوئی۔ اب میں تم سے ملانی چاہتی ہوں۔“

نہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دوپٹے سے چٹکیں پونچھ کر کہا۔

”اگر اس نے کسی کو بتا دیا تو میری ساری زندگی جہنم بن جائے گی۔ اور میری ساری آرزو میں خاک میں مل جائیں گی۔“

شاید وہ بے اعصاب سے کہا۔

”اس کا میں ڈر لیتی ہوں کہ وہ اس حلقے میں کہیں کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ تم نہیں جانتی وہ میرے جسم کا روانہ ہے اور میرے بغیر وہ ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھے ناراض کرنا بھی گوارا کرتی نہیں ہوگی۔ میں نے اسے منع کر دیا ہے اور وہ بھی کسی سے بات نہیں کرتے گا۔ تم سب گھر ہو کر یہاں رہو۔ یہاں تم ہر طرح سے محفوظ ہو۔“

اب مجھے کچھ حوصلہ ہوا ہے شاید۔

شاید وہ آگے بڑھ کر نہن کا ہاتھ چوم لیا۔

میرا میری ہمنامی! تم ہر قسم کا خوف دل سے نکال کر رہو۔ اور فی ٹوٹی رہو۔ اب میں جس اپنی ذکر پڑھنے کے لیے بھی کہیں نہ کہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں تم نے اپنے لیے ہر راست چنا ہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ جس طرح کہ میزرا راست میرے لیے بہتر ہے۔“

اب تک ایک ہنس جھڑی سے گذری اور نہن کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سڑک پر گر اڑی اور پھر کھڑکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ سامنے والی کھڑکی میں اب حین پیوں والی سائیکل کی چرخ چوں بند ہو گئی تھی۔ شاید سو کر اٹھ بیٹھی تھی اور باہر والوں میں ٹوکرانی سائیکل میں سرخس کم ڈالنے کی ہدایات دے رہی تھی۔ دھیر دھیر ان غائبے میں آ گئی۔ اور نہن سے باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ سے ہاتھوں کو ستارے لگی۔ نہن کے ذہن میں خیالات کا سلسلہ ریمو جین قید وہ آج اپنی آنکھوں زندگی کے جھٹکن کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ شاید کچھ دیر اس کے پاس بند کر باتیں کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ نہن نے بکرا سانس لیا اور گود شیا اور دوپٹے ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے سر منوٹے کی پشت سے لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے والی کوٹھی کی دیوار کے اوپر سے سوٹ مہر کچھ کھائی اور کاسنی پتوں اپنے سر اٹھائے ہوئے پیاد سے نہن کو دیکھ رہے تھے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ گھر کے نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے کچھ ٹکڑے بڑی

(۶)

کیر ایک گاؤں کی سرکوبل لگا۔

ہات یہ ہوئی کہ سیالکوٹ کے ضلع میں کیر کا ایک پار چھوٹی موٹی زمینداری کرنا تھا۔ اس نے کیر کو دعوت دی کہ وہ یکم روز اس کے پاس گاؤں آکر گزار جائے کیر کو اپنی شب و روز کی آوارہ گردی سے بھی اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ اس قسم کے سب سے دور سے کیا کرنا۔ لیکن ان دنوں اس کے قرض خواہوں کے تقاضے شدت اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ اس نے گاؤں کی سیاحت سے اپنا اور قرض خواہوں کاہل ہلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس گاؤں کا نام بھی منڈا تھا۔ کیر کو بڑا دلچسپ نام لگا۔ یہ گاؤں ریلوے لائن سے کافی دور تھا۔ کیر کے زمیندار پار ہے جس کا نام خدا بخش پرہی تھا۔ کیر کو سڑکی قدامتیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ کیر ایک دن منہ اندر چرے ہی سوئی میں ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان دنوں بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اور ابھی بہار کا موسم نہیں آیا تھا۔ اس زمانے میں زھون ابھی تو کپڑوں کی تلاش کے پکر میں تھی اور کیر سے اس کی دوسری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔

بھی منڈا گاؤں گاؤں کے لیے صبح لاہور سے ایک ریل کار یعنی ڈبہ جاتا تھا۔ جو پروردگاری سٹیشن پر جا کر رکت جاتا تھا۔ یہاں سے ایک ٹانگے پر پارہ میل کا فاصلہ طے کر کے بھائی منڈا جاتا تھا۔ سخت سردی میں کیر پیٹت فارم نمبر ۳۲ پر آگیا۔ ڈبہ کھڑا تھا اور اس میں رہنمائی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابھی اس کے پٹے میں کوئی بیس منٹ رہے تھے۔ کیر غبار کی طرح سے چلا تھا۔ دینے بھی اسے ہاتھ پار کر دینے والا کون تھا؟ وہ ایک ٹی ٹی ٹی پر جا کر کھڑا ہو گیا اور جائے کی پالی ہوا کر چکیاں لینے لگا۔ اس نے سگریٹ سلا لیا اور پیٹت فارم پر پٹے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جو پچھلے پہری مٹی خیمہ کو چھوڑ کر مجبوراً وہاں آئے تھے۔ اور بوجھل آنکھیں اور تھکے ہوئے چہرے لیے بھر رہے تھے۔ اس نے سوچا آخر ان لوگوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنی سویرے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ تو ابھی سویرے یا تو بجھل سر کے لیے گھر

سنے روئی سے شرق سے مغرب کی جانب رواں تھے۔ ایک لڑکا سائیکل پر سوار بلند آواز میں کسی فلمی گیت کا مصرعہ لاپٹا سڑک پر سے گزرتا گیا۔ شیشم کی پینٹ پر چھٹی ہوئی ایک چٹل بڑے اداس سے لمبے میں چھٹی اور اڑ گئی۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھوٹا انداز آیا اور کھڑکی کے پیلو میں چٹا ہوا پرندہ ذرا سا لڑا کر پھر نہایت ہو گیا۔ اچانک زھون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر کسی نئی آنکھ اور نئی امید کی روشنی تھی۔ اس کی پیاری اداسی اور پشیمانی دور ہو چکی تھی۔ اس نے صوفے پر سے اٹھ کر اوپن پر سے کیا۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو کر آئینے میں جھانک کر اپنا چہرہ دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی۔ سر پر دوپٹہ درست کیا اور باہر والان میں سے ہو کر پارہ ہی خانے میں چلی گئی اور شاہدہ کا ہاتھ پٹانے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس رات کیر سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیر پتلی خود رات بارہ بجے کے بعد گھر چل سکتا تھا۔ اور زھون ابھی بارہ بجے رات کو سمن آباد سے نہیں نکل سکتی تھی۔ دیکھ تو وہ کسی وقت بھی وہاں سے جا سکتی تھی۔ مگر شاہدہ سے وہ کہہ کر جائے؟ ظاہر ہے اگر وہ قلم کا دوسرا شو دیکھنے چلی جائے اور رات بارہ بجے کے بعد کیر کو اس کے گھر پر جا ملے تو پھر اسے رات وہیں گزارنا پڑے گی۔ دو تین بجے رات کو ابھی والیں سمن آباد نہیں آ سکتی۔ پھر وہ شاہدہ سے کیا بھانہ بنائے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اور رات کہاں رہے گی؟ اور اگر وہ دن ہوتے ہیں کیری کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تو اس کا منہ خالی ہے۔ اس کا کوئی لٹکانہ تو ہے نہیں۔ پھر وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کہاں جھٹکتا ہے اور دن کو کہاں کہاں ہوتا ہے؟ زھون مکلف میں الجھ گئی۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کر چکی تھی کہ یہ چھوٹا سا مسئلہ اس کے سامنے کوئی حثیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کیر کو رات بارہ بجے کے بعد ہی ملنا زیادہ نوزوں ہو گا۔ اور شاہدہ کو وہ کہنے لگی کہ بیٹیا سے رات دیر ہو گئی۔ کوئی سواری نہ ملی اور وہ اپنی ایک سیکلی کے ہاں شرمیں ہی جا کر سو گئی۔ کیونکہ شاہدہ کو معلوم ہے کہ شرمیں زھون کی وہ ایک پرانی شہیلی رہتی ہیں اگرچہ زھون انہیں برسوں سے کبھی نہیں ملی۔

سے نکلتا چاہئے اور یہ یا کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کو ملنے کے لیے — اس کے علاوہ دنیا کا کوئی کام اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کے لیے آدمی اپنی مٹیھی نیند کے سر پر جو تا مارے۔

مسافروں کی زیادہ تعداد دستاویز کی تھی۔ ان میں کچھ تو صوبوں، یلیں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور تھے۔ اور چند ایک بچے لوگ تھے لیکن دہائی بچے جو کسی کام سے لاہور آئے تھے۔ اور اب اپنے مفادفاتی دفتروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ اس دن اپنے مین ریش ان کے زیادہ ہوا تھا کیونکہ یہ دن دفتر کے ٹھیک وقت پر شہر پہنچ رہا تھا۔ کچھ نیران تھا کہ یا تو ڈبے میں اتار دیں ہے کہ قتل و جرحے کو بچہ نہیں اور دوسرے اتار دیں تھوم باہر پلٹ فارم پر پہلی پہلی چاندیوں اور بے لے کپسوں میں لپٹا ہوا ہے۔ سب اس ڈبے کے ساتھ ایک خالی ڈبہ آکر پہنچے ہوا تو کچھ کو اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔

اچھم ہم ہمارے اس خالی ڈبے پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ بیسے اطمینان سے شال کے ساتھ لگا جائے بیٹا رہا اور ان گنت بے رحمی سے دہائی لوگوں کو چاندیوں کی طرح ڈبے کے دھڑکنے میں سے اندر مچھتے دیکھا۔ وہاں کڑکوں پر ڈبے کے لیے پیشے پر تھے۔ انہوں نے تیار کردہ تھیں اور دیشوں کے بچے سے دستاویز کے دھڑکنے میں چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ کچھ نے سونہا کھینچ لیا۔ یہاں سے واپس کرنا کر اچھم سے لپٹ اور ڈھ کر سونا جائے؟ آخر ہاں منڈا گاؤں میں سوائے گروہ ہمارے اور نہرو کی اور کیا ہو گا؟ لیکن وہاں ایک ہلٹ بالکل نہیں تھی۔ یعنی کچھ سے اتار فرض واپس مانگنے والا کوئی نہیں تھا۔ اور جہاں قرض کی واپسی کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو وہاں کامیاب لاہور آئے ہوتا ہے اور پہول پوری شہن سے نکلتے ہیں اور درختوں پر طائران خوش آہن رات رات بھر نظر برزی کرتے ہیں۔ کچھ نے واپس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ڈبے میں سوار کیو کر ہوا جائے۔ سب دو آؤں پر لوگوں کا جھوم تھا۔

جھپٹ مٹی کی اور ڈبے نے دھنسل دیا تو کچھ بھی دھڑکنے میں کھڑے جھوم میں شریک ہو گیا۔ ڈبہ مین پراب پلٹ فارم بچھے کھٹے کھٹے ڈبے نے بے وقار تیز کر لی اور دیکھتے دیکھتے فیض آباد والا ایک نہرو یہ ملی اور پھر مسری شاہ اور پھر قادیان کی تہذیب گذر گئی۔ جب سر ہوا کے چھوڑنے تیز ہو گئے۔ تو اندر ڈالنے لوگوں نے چن شروع

کر لیا۔ شہر کے باہر کھڑے لوگوں کو مسری سے پورا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ہادی بار کا شیش گدرا تو مسری سے کچھ کی ناگ ٹھہر گئی۔ جسم کا پانی جھنڈا اس کے اپنے کاربھی اور گت میں پلٹ کر گا تھا۔ ہاتھ تک سر مر کا کھرا بن گیا۔ لوگوں کے ساتھ کھٹکا کھٹکا وہ بھی ڈبے کے اندر قحی گیت اب ڈبے کا دھڑا دھڑا کر رہا تھا اور لوگ ایک دو سرے کی پالیوں میں گھس کر بیٹھا گئے یا کھڑے رہے۔ ہر ڈبے کی فضا گرم تھی اور ایسی بھڑکے سے بوجھل تھی جو عام طور پر گمروں کے اسیٹیل سے اٹھارتی ہے۔ ایک دہائی چلانے تاک پر دھنسل رہا گیا۔ کچھ نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ ایک تو وہ دہائی کسی بھی پردہ کی دیر نہ سمجھتا تھا۔ وہ سب سے اگلے منظر تھا کہ تھوڑی سی دیر بعد یہ پردہ ختم ہو جائے گی یا اس کی ناگ ملادی ہو جائے گی۔ اور ہوا بھی یہی۔ دو تین شیش گمروں سے تو ڈبے سے تھوڑے عرصے میں گھٹتی تھی۔ یہ بھی تو کچھ کو اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا اب وہ خود اس پردہ کا حصہ بن گیا تھا۔ اس دن کے محاسن کے کا ایک حصہ تھی۔

نارو وال کے شیش پر ڈبہ رکھا تو بے شمار سواریاں اتر گئیں۔ ڈبہ تقریباً خالی ہو گیا۔ کچھ بڑے آرام سے ایک گدے دار نشست پر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ سورج کی روشنی میں کھیتوں کا منظر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اب نارو وال سے روانہ ہو گیا۔ سورج طوع ہو چکا تھا مگر بعد اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ دھوپ کی کہیں ایک گت بھی نہیں چمک رہی تھی۔ صرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھیت نظر آ رہے تھے۔ لائن کے ساتھ ساتھ گے شیشم کے درختوں کے پتے غنچے چکے تھے اور کھڑے شیشیاں جھنم میں بھی کھڑی تھیں۔

پہلو کے شیش پر ڈبہ رکھا تو کچھ اتر پڑاں۔ کچھ آہٹیں والا بیٹا ٹیڑھا پلٹ فارم۔ ڈبے کے انجن میں سے باہر نکلا ہوا میلی دروئی والا غار میں۔ ایک طرف دنگے سے لگ کر بیٹھی ہوئی ٹیکہ دہائی عورتیں پہلی پہلی آنکھوں والی ایک پاگل فقیہی۔ کٹ پکڑ کی لات کھا کر بھاگ ہوا ایک غار ش زہر کٹ۔ کھڑے درخت۔ گیت کی طرف جاتے ہوئے دہائی لوگ اور بس — یہ تھا پور کا شیش!

حکیم سے پانچ روپے لیے ہوں گا تو تمہاری دعا اور دعاؤں سے میری بیماری دور ہوگی۔
 حکیم نے سمجھتے اس کی طرف دیکھا دیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلا گیا۔
 "میں سمجھتا تھا کہ یہ کور لیسٹ سمجھو نہ ہی مڑا کو۔ جس میں پانچ روپے کی بجائے میں دو
 روپے خرچ کر کے واپس لاہور ہی گئی تھی۔ چلا جاؤں؟" بلو نے سمجھتے کہا۔
 "پھر کچھ ان بھی جیسا کہایا تھا وہ سمجھ گیا تھا کہ بلو جی واپس لاہور نہیں جاسکتے اور
 جی مڑا گاؤں مڑو جاسیں گے۔ یہ ایک بات ہے کہ اسے پانچ روپے نہ دیں۔ چنانچہ
 اس نے سمجھنے کی ایک پٹائی افادہ کر کہا۔
 "وہ جاز آئے کم سے کم دس روپے جی۔ آپ اسے نہیں کیا کیا ہے۔"

کچھ بھی کوہان سے کم نہ تھا۔ بلکہ وہی اعتبار سے وہ کوہان کی سطح سے بھی
 نیچے آ سکتا تھا۔ وہ کوہان کو ہار ہار بھی کہتا رہا کہ اسے وہ لاہور ہی واپس جاسے گا اور
 اس نے گاڑیوں کے ٹکٹ اور بات و بیانت کیے کہ کوہان کو یہ نامید ہو گیا ہے اسے
 کچھ کچھ چین ہو گیا کہ مسافر واقعی واپس جا رہا ہے۔ ظاہر پتہ ہے نکل رہا ہے۔
 چنانچہ وہ تین روپوں پر مٹی مڑا چلے پر راضی ہو گیا۔ کوہان اور میزمر کا قیام اور علیا
 اس کا کام تھا۔

اس کا آئندہ کمزور کر کے چن تھا۔ بظاہر اس کا بظاہر وسیلہ تھا مگر اس کے اندر
بڑے سے بڑے گڑھے میں گر کر باہر نکل آئے کی طاقت موجود تھی۔ کبیر بھلی
نسبت پر چڑھ کر پوز کیا تھا۔ "اسی منٹا" گاؤں کی طرف چل پڑا۔ پیشین نے ایک پتلی
کی سڑک بنو کر مجھ کو کر پھروں کے شہر بھی داخل ہو گئی تھی۔ شہر پر ہوا تھا۔ کالی گئی
رواؤں والے ہندوؤں اور عیسویوں کے گائے لٹے لٹے تھے۔ چھ جالی دار بھروسے والے
مکان گڑھے تھے۔ شہر کا ایک پرنسپل سارو واڑہ بھی تھا۔ جس کے اندر اکھڑے ہوئے
غرض والی سڑک اوپر کو اچھی چلی گئی تھی۔ بائیں شہر کی رواد کے ساتھ ساتھ جانور
حق سب سے سڑک پر ٹوکوں اور چادریں میں سولیوں، گاجروں، ٹٹاؤں، اور بڑوں
کے ڈیر لگے تھے۔ اور دیمائی ایک دو بڑے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے انگلیاں دبا کر
سو رہے بازی کر رہے تھے۔ یہ انگلیاں دبا کر بنو دیا کرنے کا طریقہ بھی بڑا اچھا ہے۔ کسی
ناتے میں عورتوں کے سو رہے بھی اسی طرح ہوا کرتے تھے۔ ذرا الٹی دبا کی اور عورت
کو اغوا کر کے پر ڈال کر ٹکڑے لگے۔ جس طرح یہ دیمائی اب گاجروں کا شہر تھا
لے جاتے ہیں۔ عورت کی حیثیت اس دور میں بھی گاجر سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر

[illegible]

”ہاں جی کہاں جاتا ہے؟“
ایک جوان نے اس کو جو ان اپنے کیر کے پاس آ کر پوچھا۔ کیر نے سمجھو اس کی
طرف دیکھا کر کہا۔
”سمجھو کہاؤ گے؟“
کوچہ ان شرمندہ سا ہو گیا اور کہنے لگا۔
”ہاں جی بس اللہ کو“
کیر نے پوچھا۔

”ہی منہا کتنی دور ہے یہاں سے؟“

”میں وہاں لے چلو مجھے۔“
 ”نہ کرنا کہیں پاؤ گی۔“
 کوہنوں نے کوڑے کو ایک ساتھ مارا۔ گھبراہٹ اور بے آرامی سے اپنی گلی بندھی چال پر پھر چل پڑا۔ گلوں سے باہر ایک چھوٹی سی خشک سیر کے کنارے پہلے رنگ کا ایک لخت چٹیل مکان نظر آیا۔ کوہنوں نے اشارے سے کہا۔
 ”یہ ہے یہی پرہیز گاہ کا مکان۔“
 ”یہ کچھ پرہیز کے مکان کی طرف بھیج رہا تھا کہ مکان کے باہر بیٹھے کچھ دیہاتی آئے کہ اندر چلے گئے۔ جس وقت آگے مکان کے باہر دیکھ کر پرہیز گاہ کے باہر آ رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر کچھ کاغذ پیش کیا۔“
 ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گے۔“
 ”کیوں؟“
 ”بادشاہ آدمی ہو۔“
 ”کبھی کبھی بادشاہ بھی سفر پر چل پڑتے ہیں۔“
 کیر نے ہاتھ دالے کو تین روپے دیے۔ آگے لے کر گلیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ بعد ازاں پرہیز گاہ کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں ساری ساری سجاد والا جوان تھا۔ جس نے شہر سے لی اسے کیا تھا اور اب گلوں میں اکیلا اپنی زمینداری کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔
 ”تمہارا سامان کہاں ہے؟“
 ”گھر میں۔“
 پرہیز گاہ پر چلا۔
 ”چلو اچھا کیا تم کچھ ساتھ نہیں لائے۔ ورنہ وہ ضرور دہلی ہی میں رہ جاتا اور مجھے ریلوے والوں کو در خواستیں بھیجنا پڑتیں۔“
 اب دھوپ خوب چمیل گئی تھی اور وہ اس طرح تاب رہی تھی جیسے کبھی چمیلی نہ ہو۔ کچھ گھن میں چارپائی اور کرسیاں ڈال دی گئیں۔ کیر نے اور کوٹ اتار دیا۔ جوتے کھول دیئے اور چارپائی پر آگئی پائی مار کر بیٹھ گیا۔ آگے میں پانی سے بھرا ہوا جگ پڑا تھا۔
 ”مٹہ ہاتھ دھو لو۔“

”میں نہیں کی کوئی ضرورت نہیں۔“
 پرہیز کے کوڑوں نے اسی وقت کھانے پکانے کا کام شروع کر دیا۔ کیر نے شیوہ بنائی اور باہر ایک گنا کھیت میں سے توڑ کر چبے لگا۔ اچانک مرغ کے چپٹے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پرہیز کا ایک لمبے رنگ لال لال آنکھوں والا نوکر کھیلے مرغ کو چلانے کی فکر میں دو ٹوٹی پاؤں چھلانے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کالا مرغ اور اور چکر کھانا اپنی جان بچانے کی فکر میں ڈانٹا چلا رہا تھا۔ شاید پرہیز کو چلا رہا تھا۔ مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی زبان میں چلا رہا تھا۔
 ”چھلا۔ چھلا۔“ یہ لوگ مجھے قتل کرنے لگے ہیں۔ میری مدد کو مجھے ان قاتلوں سے بچاؤ۔ پرہیز باہر پرہیز آنکھوں کیوں آ رہا۔
 مگر کسی کے گل پر ہوں کتنے نہ دیکھ رہی تھی۔ ایک دیہاتی سبز مکیاں کا کھنسا لڑنے لگا۔ کبھی چپ چاپ چلا رہا تھا۔ مرغ پاگوں کی جگہ روکا چلا رہا تھا۔ وہ دیکھا اس کے پاس سے گذر کر کہاں سے کوئی توجہ نہ دی۔
 ”آج پرہیز کے لال لال آنکھوں والے لمبے رنگ نوکر نے مرغ کو پکڑ لی۔ وہ چلی جی مٹی کے ساتھ مرغ کو بھل میں روکے کیر کے پاس سے گذر رہا۔ مرغ نے قبر آگے لگاؤں سے کیر کو دیکھا اور کہا۔
 ”کیجئے! صرف تمہاری وجہ سے مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔ جس کس سانسے نے کہا تھا کہ شہر سے یہاں آؤ۔ میں کیا مجھے تیرے کوڑے کے ڈھیر سے ہاسی چال چن رہا تھا۔! بشر کے ذہن میرا چپ ہو گا اور تمہارا گریبان۔“
 کیر نے سڑک لڑا اور منہ پھیر کر گنا پوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے آگے سے کھیلے مرغ کا آخری ٹھوٹھیر بلند ہوا اور پھر وہ جگہ کے نیلے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد لمبے رنگ نوکر نے مرغ کی کھال پہنے اور موہ گردن باہر لے کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی۔ کالا مرغ اپنی چترائی ہوئی ہے اور آنکھوں سے ابھی تک کیر کو دیکھ رہا تھا۔ کیر اندر آ گیا۔ پرہیز کیر کے بدل چکا تھا۔ یعنی اس نے گرم کوٹ اور گرم چٹون پہن لی تھی۔
 ”چلو یاد چھیں گلوں کی سیر کروا لائیں۔ دیکھی پڑ کھانا بھی تیار ہو گیا ہو گا۔“
 ”وہ توں گلوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے خشک شہر کو پار کیا اور ایک میدان میں سے گذر کر بچوں کو کھیل ہوا چھوڑ کر ”بھئی منڈا“ گلوں کی حدود میں داخل

پھر وہ قرب ہی چھٹی ہوئی برساتی میں آگیا۔ یہاں اس پر ایک بڑا سا کڑاؤ چڑھا ہوا تھا۔ اس میں تازہ اور شہری دس اہل رہا تھا۔ برساتی اس کی چٹلی بھاپ سے بھر چکی تھی اور یہ بھاپ سانس کے ساتھ اندر جا کر لہو کی چوڑی اور گرد ملی فضا کے لئے ہونے لگی تھی۔ وہی دس چھوٹے دس چھوٹے ایک آدمی بکڑی کا بھاڑا کڑائی میں چلا رہا تھا۔ کیونکہ اب گزرتے ہی والا تھا۔ اور گئے کا دس خستہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوسرے آدمی تینے بکڑی کے پڑے سے سامنے کو اٹھ کر صاف کر دیا تھا۔ جب دس بچہ کر تیار ہو گیا تو وہ آدمیوں نے لے کر کڑائی کو اٹھایا اور خدا کا نام لے کر بکڑی کے سامنے میں الٹ دیا۔ اب بکڑی کے سامنے میں بھاڑا بھرا جانے لگا

اب پر کسی کبیر کو گاؤں کے کنارے ایک درے پر لے گیا جہاں گڑ بٹا جا رہا تھا۔ دستانہ نے ان کی بڑی آواز بھٹ کی۔ فوراً ایک چارپائی اچھوپ میں اڑا کر اس پر چھوڑا۔ چارپائی اور چھوڑا اڑ گئے۔ کبیر اور پرہیسی جیتے بگٹے آگے بڑھے رکھ دیا۔ آگے دو تھمن دستانی زمین پر ٹپٹپٹے چلے گئے۔

حالت پر مبنی رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کے ساتھ بھی
 "کیونکہ انہی جان پر مبنی ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک کے لئے یہ ہے کہ
 خدا انہیں پر مبنی ہے۔ تمہارے دل کے ساتھ ساتھ تمہارے جسم کے ساتھ بھی
 "یہاں تک کہ تمہارے دل کے ساتھ ساتھ تمہارے جسم کے ساتھ بھی"

۱۔ خدا جدا کر کے چھ کوس کا فاصلہ طے ہوا۔ گاؤں آگیا۔ ایک ٹھوبہ دہل کے باہر گھوڑے رک گئے۔ خدا بخش پہلی گھوڑے سے پیچھے اتر آیا۔ کبیر جب پیچھے اترنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی دونوں ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو چکی ہیں۔ وہ یہی مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور اپنا چارپائی پر بٹھار کیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی ٹانگوں کو ہوش آیا تو وہ پہلی کے کندھے کا بٹھارے لگا کر گھوڑے پر ایک قریب کھڑا۔ نگاہ ڈال کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ کبیر، جیران ہو رہا تھا کہ دہائی لوگ عورتوں کو گھوڑوں پر زبردستی بٹھا کر اغوا کر کے کس طرح لے جاتے ہیں۔ اگرچہ کبیر کے ذہن میں کبھی عورت کے اغوا کرنے کی دیرینہ خواہش پروٹھل پارتی تھی۔ لیکن اس روز اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی دہائی عورت کو کبھی اغوا نہیں کرے گا۔

وہاں کا بڑا قلعہ۔ رنگہ گراما ساہوا قلعہ۔ دانت چٹانچے تھے۔ آگھوں کی چٹانیں بہت کثرت سے ملتی تھیں اور زبان ٹوب تیز چلتی تھی۔

مستور میں تو ایک فقیر ہوں۔ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا ہوں اور وہ بھی اہار کے ساتھ صرف ایک روٹی۔ اپنے ہاتھ سے کھا کر کھاتا ہوں۔ کبھی غیر از رت حلال نہیں کھاتا۔ کیونکہ بتول مولانا دوم۔۔۔ عشق و رقت آباد از جن حلال۔۔۔ عروم کی کھائی سے عبارت بھروسہ ہوتی ہے۔ عشق کی واردات قلبی فطس و فحور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ان کدہ ہو جاتا ہے۔ میں نے اسی موضوع پر سنا رکھ لی میں اپنے مریدوں کو انہی پر نہیں لکھتا تھا۔ خوشبو کیا ہے؟ پھول آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اسے چھو سکتے ہیں۔ اسے کھا سکتے ہیں۔ مگر خوشبو کو نہ تو آپ چھو سکتے ہیں۔ اور نہ اسے چکڑ سکتے ہیں۔ بس خدا ذات خوشبو ہے۔ جو موجودات کے ہر پھول میں ایسی ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی معاً "جو صاحب کے چہرے پر قاتلانہ مسکراہٹ آگئی اور وہ انگلی سے کرسی کے بازو پر ہلکا سا جھانپنے لگی۔ باہر نکل کر خود بخود پیش پریشی نے کبیر کو

تاکہ گڑ کی غنّی ہوا رہے اور وہ کہیں سے غنم نہ رہ جائے۔ جو نوزی جی دیر میں رش بخت ہو گیا اور گڑ تیار ہو گیا۔ اب انٹلوں نے اس کی گرم گرم جیلیں بنانا شروع کر دیں۔ اور انہیں کوکری میں ڈالنے لگے۔ کیونکہ انھوں نے خود ڈاندا جائزہ گرم گرم گڑ لیا اور اسے کھانا ہمارا کھا۔

وقت ایسے چلے آئے والی باتیں۔ لڑاؤ زمین کی فصل بھسی ہوئی ہے؟ لڑاؤ زمین کو کرب پائی مل رہا ہے؟ جو لڑاؤ لگے ہوا تھا اس کی تاریخ کس دن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ گھر واپس آکر انہوں نے مل کر اس کالے مرغ کو کھایا جس نے ذرا ہونے سے پہلے بڑا دھڑکا دیا تھا اور سارے گاؤں کے آگے رحم کی اپیل کی تھی۔ لیکن جس کی اپیل مسترد ہو گئی تھی اور وہ دم توڑ گیا تو کرائے ان کی مگران پر چھری چلا دی تھی۔ مرغ خست رہا تھا۔ بڑا خدی اور خست جان تھا۔ کبیر اسے کھارہا تھا اور اسے ہر گھنٹے پر گھنٹے میں کھائے مرغ کی گالیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مرغ بڑا خست و خوار تھا۔

”کیسے کہا رہے ہو؟ مجھے چار رہے ہو؟“

۱۰۰۔ مگر کبیر بڑے عقربے تھے۔ کہاں سے جا رہا تھا۔ کہاں سے بہہ چلائی تے وہ گھوڑے
 منگوائے۔ زبان پر زین کسی کہیں بچھوائے اور دوسرے گھاؤں کی سیر کو چل چلا پر کسی
 فورا گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ وہ زمیندار تھا اور اس قسم کی سواری کا بخوبی قہر کبیر
 کی سائیکل پر بھی سوار تھا۔ ہوا تھا۔ اس نے ایک پاؤں دنگل میں ڈال کر دوسری
 ٹانگ اٹھائی کہ گھوڑا صاحب پر سے اٹھک نکلے۔ کبیر نے ہلکے ہلکے کی۔ گھوڑے
 صاحب نے اس کو شل کو بھی چاکم بنا دیا۔ آخر ایک جگہ سے گھوڑے کو قحط
 رکھا۔ کبیر اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ایسے بول لگا جیسے وہ گھوڑے کی گردن پر بیٹھا ہوا
 ہے۔ گھوڑے صاحب مزے مزے کھینچا نکھیت ہو کر دوسرے گھاؤں کی جانب چل
 رہے ہیں۔ چوبیس کے قافلہ پر تھایا۔

نہا کبیر کا گھوڑا کبیر ہی کی طرح بے جگم تھا۔ اور اس کا نہ کوئی سر تھا نہ پی۔ دو چلتے چلتے ایک دم کھڑا ہو جانا اور کھڑے کھڑے ایک تخت چل پڑ گیا۔ دو بھی نہ بتا کہ اب کھڑا ہو رہا ہے۔ اور اس خیال کا بھی افسار نہ کرنا کہ اب چلتے والا ہے۔ ایک بکڑ۔ اس نے ایسی دولتی جھاڑی کا کبیر کرتے کرتے پہلے خدا چھوٹا ہونے پر ہی بڑا کبیر کی

بتایا کہ یہ شخص اپنے ہر مہر سے خزانہ لیتا ہے۔ خود رہنمی لطف اور ہوش کر سوتا ہے اور انہیں لکھنے سے فرش پر صرف پانی ڈال کر سلاتا ہے۔ لوگوں نے اسے زمین سخت دے رکھی ہے۔ مہر وہاں مفت کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی مزید بغیر خزانہ لے آجائے تو یہ اسے محفل سے باہر نکال دیتا ہے۔ یہاں مہروں نے کئی چاول کی مگوں، مٹھر، کتا، گائے، چھانک، برسوں کا پتل، کھڑی کا کھڑ اور روپے بھی وصول کرتا ہے۔ لوگ پھر بھی اس کے دے دے ہیں۔

۱۰۔ ان کیر نے سگریٹ سٹاک کرنا چاہتا ہے۔
۱۱۔ ان اگر یہ شخص فراہم کرے تو تم اسے کیوں مٹے ہو؟
۱۲۔ اس شخص نے کہا کہ میں خود فراہم ہوں۔

۱۳۔ اور دونوں کل کھانا کر رہے ہیں۔ وہ ایک کھیت میں سے گزر رہے تھے۔
۱۴۔ یہاں سے جب کہ درود رکھ کا ایک پھول توڑا اور کیر کو دے کر بولا۔

۱۵۔ "دیکھو کیسی خوشبو ہے؟"
۱۶۔ کیر نے پھول کو سونگھا۔ بڑی مٹھی اور بھل سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

۱۷۔ "کیسے کیا پھول ہے؟" کیر نے پوچھا۔
۱۸۔ "کوئی کتا ہے۔" کیر نے بولا۔
۱۹۔ "تو اس کو دے دے۔"

۲۰۔ "تو اس کی قسم آؤ گا پھول ہے۔"
۲۱۔ کیر نے زندگی بھر کبھی آؤ کا پھول نہ دیکھا تھا۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ آؤ ایسی عمدی بڑی کبھی آؤ کا پھول ہو سکتا ہے۔ اس نے پھول اپنے گوت میں لگا لیا۔

۲۲۔ کچھ دن گاہوں کی سیر کرنے کے بعد وہ دونوں واپس اپنے گاہوں کی طرف چل پڑے۔ اسی طرح دونوں گھوڑے دربار شہر کی ہنسی ہنسی روانہ ہو گئے۔ کیر تلبہ اپنا گھوڑا بڈل لیا۔ لیکن یہ گھوڑا بھی پہلے والے کی طرح ضدی، آنکڑ اور ہڈی کی طرح کیر نے لیا۔

۲۳۔ "میں مرزا سودا کے گھوڑے کی طرح اسے بھل میں دبا کر واپس جا سکتا ہوں مگر اس کی بیٹہ پر سوار ہونا بڑا دشوار ہے۔"
۲۴۔ یہاں سے کیر نے گت کر لیا۔

۲۵۔ "کیسے! یہ اصل گھوڑا ہے اصل۔ اس کا ٹھکانا کچھ دور کی فوجوں کے ساتھ

۱۔ یہاں سے کیا تھا۔
۲۔ پھر تو اس گھوڑے کا نام پھینا تو سن ہو گا۔

۳۔ کیا خبر یہ جالی ہوس ہی ہو۔
۴۔ جالی ہوس ہی ہو گا پریکس۔ مگر یہ یہ مجھے اپنے اوپر لٹو کی طرح بھی نہ سمجھا۔

۵۔ شام کو پریکس نے اپنے گتے کو کیر کے کھانا دیا۔
۶۔ "یہاں سے پریکس کو اس گتوں کی کھانے لگا کا مذاق بہت اڑاؤ۔"
۷۔ پھر کیا دے گے۔

۸۔ مٹھی۔
۹۔ پریکس قندہ لگا کر بولا۔
۱۰۔ "اساتے پریکس ہوش میں نہ آئے۔ کچھ دیر ہو جائیے گا۔"

۱۱۔ "نہ تو پھر تانہ اور گرم دودھ پلاؤ۔"
۱۲۔ "کیسے؟" کیر نے پوچھا۔
۱۳۔ "پریکس نے اپنے لم ڈانگ کر کے اسی وقت تانہ دودھ پلاؤ اور اسے گرم کر کے کیر کو دیا۔ کیر نے گوت پلا تو بولا۔

۱۴۔ "میں یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تانہ کا دودھ لیا رہا ہوں۔"
۱۵۔ "تو اس کا کل پریکس کل کھانا کر رہے ہیں۔ کیر نے کھانا۔

۱۶۔ "جیسے کھانے؟" اس دودھ میں اس وحرقی کی خوشبو ہے جس پر تم ایک پہ سلاخ کی طرح آؤ گے کھانے ہو اور یہ لم ڈانگ کر کے کیر کی طرح سٹ کر بیٹھا ہے جس کے گتوں میں گتے کے سون گتے ہیں۔ اور برسوں کے درود پھول فروب ہوتے سورج کی شفق میں سرخ ہو رہے ہیں۔ یہ دودھ نہیں بلکہ اس وحرقی کا سیال آسمان سے ہے۔ کچھ بڑی شفق ہے اور وحرقی ہماری ماں ہے۔ یہ ماں کا دودھ ہے۔ یہ دودھ کی ماں ہے۔ اور تم ڈیل ہو جو میل رو کر چائے پیتے ہو۔"

۱۷۔ "جیسا اب شامی مٹے گا۔ دودھ لپٹا ہو رہا ہے۔"
۱۸۔ "کیسے؟" کیر نے پوچھا۔

۱۹۔ "میں یہاں سے کھانا نہیں ہو سکتا۔ اس میں ہزاروں سورج گرہوں کو رہے ہیں۔ یہ جیسے گرم، پھر پھر اور پھر رہے گا۔ یہ دودھ نہیں بلکہ دنیا کے تمام حیاتین کا مٹھ ہے۔ جسے چاندنی راتوں میں کتواری لڑکیوں نے اپنے ڈانگ

آگیا۔ انہوں نے ٹٹ کر بھتا ہوا کھشت اور صبح کا مرغ کھایا۔

”اب کو میرے پاس بیٹھو گے یا دور سے کمرے کمرے میں جاؤ گے؟“

وہ کہتے جاویں کیا کیا نہیں کرتی۔ پیسے چھ آئے تو بوتل کی بوتل خالی کر دئے "کبیر
چنگ پر نیم دروازہ سرٹ لی رہا تھا۔ اور بڑی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی
شراب کے دو گھاس لی تھی۔ اسے نشہ ہو گیا۔ اب وہ کھلے گلی تھی۔ وہ باتیں کرنے
لگی اور کبیر کی طرف دیکھ کر شکر آئی۔ ایک بار اس نے کبیر کو اشارے سے بلایا بھی۔
پھر پوچھتی ہے کہنے لگی۔
"یہ جی جاتی ہیں کیا؟"

پہنسی قندہ لگا کر جس پر وہ کبیر غلامی سے بھرت پیتا رہا اور ان دونوں کو دیکھ کر رہا۔ پہنسی نے کمرے میں جات چلا رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے فقہا کرم ہو گئی تھی۔ وہ صرف بیان اور حدیث پر تھا۔ دینے بھی چوکیدہ انہوں نے شراب پی رکھی تھی اس نے انہیں سہی نہیں لگ رہی تھی۔ لڑکی نے ہاتھ کر قیض اتاری اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ لڑکے ہاتھ کوں بھول گئے اور بہت ہواڑا تھا۔ وہ شراب کے نئے میں کمرے کمرے بھرم رہی تھی۔ وہ کبیر کے پاس آکر بیٹھ گئی اور وہی ٹیلی آگھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ کبیر اس کی ٹیلی ہی اٹھیا کر دیکھنے لگا جس میں سے اس کا عیاں بند صاف نظر آ رہا تھا۔ کبیر نے محسوس کیا کہ شرطیں کے ساتھ ملے وہاں میں سے بیٹھ رہا ہے۔ کبیر ہاتھ اتر رہا تھا اور اب اس کی جگہ سرور کی ایک شخص کیجنت چھا رہی تھی۔ کبیر بھرت مت نہیں دہانتے ہیں فور سے نیم عرواں شرطیں کے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ پہنسی نے گھاس میں پٹی ہوئی شراب علی میں ایللی لیا۔ ایک اور بیٹھ بنایا۔ شراب سے بھرا ہوا گھاس ہاتھ میں پکڑ کر شرطیں کے پاس آیا۔ اپنے ہاتھوں سے گھاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے تاج کبیر کر چھ گھنٹ پچے اور اور لپٹا آپ پہنسی کے حوالے کر دیا۔

شراب اور شریوں کی ماں اپنا کام کر چکی تھی، اب خدا کا نفع پروری کو اپنا کام کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو تین موم قبائل اقبال میں روشن کیں۔ انہیں بجلیاں اور شریوں کو گھر میں اٹھا کر کمرے کے چکر لگانے لگا اور ان کے جسم کو جگہ جگہ سے چوستے لگانے کیلئے ایک موم بنی اٹھلی اور ساتھ والے کمرے میں جا کر اپنے چنگ پر بیٹ گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جسم ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی حالت کے مطابق بندھے باقاعدہ مقابلہ کر رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں، کبھی یوں معلوم ہوتا

[illegible]

شرطیں انصوری جان آگے آکر رکھ جاتیں تو میں یہ جیسے اچھٹے دم ملت سے
 ملاؤں۔ یہ میرا دل فائدہ پہنچا رہا اور سے لڑی جیسے بلا ہمارے سبب لٹ صیانت بیکہ دفتر
 میں آکر لگا ہے۔ تیار ہی زمینوں کے پھل ان کے پاس ہی لگے ہوئے ہیں۔ یہ جیسے لگاؤ
 ہے کہ جس جانتے ہی کاغذوں پر پھر لکھ کر دیاں گئے۔ اس کا لگاؤ
 ہونکی شرطیں جو لکھن میں سیکڑے کے پوسٹ پر پہنچے گئے۔ عارف ان کے کچھ سے اچھا
 کو لایا اور اسے بے کر خود بندہ کیا۔ لایا ہوا جانی کر کے لگے۔ گیس کی تیز روشنی میں لڑکی
 کا چہرہ سالہ ان کی پست رہا تھا۔ اس کا ہر ایک گھڑی تھا۔ پہلے بیکے پست سے تھے۔ عمر
 سولہ یا ستر سال ہے۔ لڑکیوں میں تھی۔ لڑکی عمر بخت مند اور خوش حال لڑکی تھی۔ اس کی
 نے آگےیں جگا رہی تھیں۔ اور ہر دہائی سے پہلے یا یوں دکھار میں کسی جسم کی جلی
 قادی نہیں کر رہی تھی۔ ہر دہائی میں کیا۔ اس کا لگاؤ۔ اس کا لگاؤ۔ اس کا لگاؤ۔
 بیکہ اس کی عمر اور پوسٹ موت کی شرم پر بہت جانتے رہے۔ زمینداروں کی
 کے پاس دور دور تک جاتی ہے۔ ہے تو وہاں اپنا مگر کر لیں جو ان کو ایک ہل میں رہا
 مگر اگر کوئی ہے پہنچے غلام کے بچوں میں لکھی چری ہے۔ لکھی ہے۔
 ہونکی نے لادری میں سے شراب نکال کر صبر رکھ دی اور گلاس میں بھر کر لایا۔
 چند گھنٹ خود پیئے اور باقی لڑکی کو پلا دی۔ لڑکی نے تھوڑی سی مزاحمت کی مگر پھر
 ملاؤں کی لڑکی پہنچی نے انگریزی میں کیا۔ اس کا لگاؤ۔ اس کا لگاؤ۔ اس کا لگاؤ۔

”کیا بات ہے؟“

”نہاں نے ایک گرو سائنس لیا اور بولی۔“

”سبھی شکاری کر رہی ہوں۔“

”کیر نے مسکرا کر نہاں کو دیکھا اور سگریٹ سٹیک کر ڈالا۔“

”مہارگ ہا۔ مگر وہ خوش نصیب کون ہے؟“

”تمہارا دوست۔“

”میرا دوست؟“

”ہاں۔۔۔ جو محلہ سر کے دور کتابت میں فہرستی ہے۔“

”کیر نے حیرت سے نہاں کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نہاں اس

فہرستی سے شکاری کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ یہ تو دھوکا ہے اور جس کی آمدنی بھی

محدود ہے۔“

”لیکن تم ایک سو چھتیس روپے ماہوار میں ایک ان پڑھ کے ساتھ دو لڑکیوں

سمیت گزار کر لوی؟“

”نہاں نے چہرہ اٹھا کر کہا۔“

”میں شریف رہی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپس کے لئے مجھے دن

میں ایک وقت بھی روٹی مل جائے تو میں چار ہوں۔“

”بہتی خوشی کی بات ہے۔ میں کل ہی اس سے بات کرتا ہوں۔ مجھے پورا یقین

ہے کہ یہ شادی ضرور ہو جائے گی۔ مگر بھی تم ایک بار باہر سوچ کر لو۔“

”مجی کے کام کے لئے صرف ایک بار سوچنا ہی کافی ہوتا ہے۔“

”کیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اب مزید سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں تھی۔

اس رات کی طرح کیر نے جنگ خانی کر دیا۔ نہاں کے انکار کے باوجود اس نے نہاں

کو اپنے چنگ پر سٹا دیا اور خود آرام کر رہی پر کپیل اوڈھ کر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر تو

وہ چست رہا۔ مگر اس نے جی بھرا دی اور آنکھیں بند کر کے نیند کے خلاف جنگ

کرتے لگا۔ نہاں کو نیند آگئی تھی۔ کچھ دیر بعد کیر بھی سو گیا۔

اگلے روز کیر نے نہاں کو ساتھ لیا۔ اور یونیورسٹی کے بس سٹاپ پر آگیا۔

جہاں سے اس نے نہاں سے چار بیٹے ملنے کا وعدہ کر کے اسے بس میں سوار کروا دیا

نہاں کیر کے ساتھ اندر کمرے میں آگئی۔ کمرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی

تھی۔ وہی پرانا بستر، کنبوں سے بھرا ہوا میز، بوسیدہ آرام کرسی اور پانی کی سرائی اور

ذرا سے ٹکڑا ہوا کینڈر۔ جس پر شادی کچھ کی تصویر تھی ہوئی تھی۔ کیر نے جی جلا

رکھی تھی۔ ایک کتاب سرہانے کھلی پڑی تھی۔ کمرے میں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی

تھی۔

”تم پھر رہے تھے کیا؟“

”ہاں۔۔۔ تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟“

”نہاں نے مسکرا کر کیر کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ ایسا کر چنگ پر رہ گیا اور آرام کرسی پر

بیسے سکون سے بیٹھ گئی۔“

”تم نے جو کہا تھا کہ تم رات بارہ بجے کے بعد مل سکتے ہو۔ آج تم سے ملنے کو

مئی چاہا اور میں پہلی آئی۔“

”اچھا۔ کیر مسکرایا۔“

”بہت خوب۔۔۔ اچھا کیا تم نے؟ لیکن اب میں چارہ بجے سے پہلے بھی مل

سکتا ہوں۔“

”اچھا؟“ نہاں نے خوش ہو کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے اپنے قرض ادا دیتے ہیں۔“

”مہارگ ہا۔۔۔ کیا کہیں یہ لارڈی لعل آئی تھی؟“

”کیر ہنسنے لگا۔“

”ایک اور جگہ سے قرض لے۔ یہ قرض پہلے کر دیا۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ

کمرے کی جی جی جتنے کٹی ہے۔ مکان کا کرایہ بھی ادا کر دیا ہے۔“

”مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جس کسی قسم کی پریشانی اٹھانی

پڑے۔“

اس کا کیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چنگ پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ نور

مردان جھکاتے جیسے چھرائی ہوئی آنکھوں سے فرش کو تنک رہا تھا۔ جہاں سگریٹ کی

راکھ تھکری ہوئی تھی۔ نہاں نے بھی یہ بات کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔ کمرے میں گھسی

خاموشی چھا گئی۔ پھر نہاں نے سر اٹھایا اور بولی۔

”میں تمہارے پاس ایک خاص شخص کے کر آئی ہوں۔“

اور خود اپنے مسزے دوست سے ملے ٹکڑے ٹکڑے کی طرف چل پڑا۔ مسزے اسے درکشاپ میں کام کرتا مل گیا۔ ذرا دھننی عمر کا یہ قوف سا سیدھا ساٹھ ساٹھ پتکا آوی تھا۔ کبیر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ درکشاپ سے باہر لے آیا۔

"لیکن میں شادی پر کچھ خرچ نہ کر سکیں گا۔ بس فریادہ انداز میں۔۔۔" کبیر نے بات کٹ کر کہا۔

"لڑکی دو کپڑوں میں تھامے پاس آجائے گی۔ باقی تم جانو اور خیرباد کہو۔"

مسزے بہت خوش ہوا۔ اس کی تو خدا نے سن لی تھی۔ تین روز بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ کیونکہ یہ تو مسزے ہی کو کسی سے کچھ پوچھنا تھا اور نہ کبیر کو کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت تھی۔ کبیر بڑا خوش خوش مسزے سے اجازت لے کر وہاں سے آ گیا۔

نہیں سمجھے۔ پھر کو اس نے زینون سے مل کر اسے خوش فہمی ستا دی۔ زینون کی جان میں جان آگئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے مستقبل کے سدھرنے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ اب وہ باقی ماندہ زندگی ایک شریف بیوی بن کر گزار سکے گی۔ اس کے بھی بچے پیدا ہوں گے۔ وہ بھی ایک نیک دل اور دھرم دار ہو گی۔ خدمت گزار بیوی ہو گی۔ وہ بچے ہوئے کپڑے پہن کر گدڑ پر سوار ہو گی۔ مگر گھری چار دیواری سے باہر بھی قدم نہیں رکھے گی۔ اسے صرف یہی ایک ذرا حاکمہ لگتی اس کے غلام کو اس کی مچھلی زندگی کے واقعات کا علم نہ ہو جائے۔ لیکن اس کے لئے اس نے خدا پر بھروسہ کر رکھا تھا۔

تین دن بعد زینون کی مسزے فیوز دین۔ نے شادی ہو گئی۔

یہ شادی کبیر کے ایک دوست کے ہاں ہوئی۔ فیوز اپنے باپ اور بھائی کے تین بزرگ آدمیوں کو ملے کر کبیر کے دوست کے ہاں آ گیا۔ وہاں مسزے فیوز دین سے زینون کا تعلق چاروا دیا گیا۔ چائے اور مٹھائی سے ممتازوں کی خاطر عمارت کی گئی اور کوئی دو گھنٹے بعد زینون کو اس کے خانہ کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ کبیر نے مسزے کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ زینون کی پہلے ایک جگہ شادی ہوئی تھی مگر اس کی تہ نہ سکی اور ایک سال بعد طلاق ہو گئی۔

مسزے فیوز دین بڑی خوش خوشی رات لے کر واپس گھر آ گیا۔ آج اس کی

سرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی بہنوں نے دھنن کا خیر مقدم کیا۔ دھنن خوش شکل اور جوان تھی، ان کے خیال میں تو ان کے بھائی کی قسمت کھل گئی تھی جو اسے چاند لکھا دھنن مل گئی تھی۔ زینون دھنن کے لباس میں شرم سے سر جھکائے پٹنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی سوتیلی بیٹیاں نے کپڑے پہنے اس کے ارد گرد دھننی تھیں۔ انہوں نے دھنن کو بھی بھانے اور گیت بھی گائے۔ پھر سب لوگ چلے گئے۔ لڑکیاں سو گئیں۔ فیوز دین کا باپ بھی سو گیا۔ مسزے فیوز دین نے بیڑیوں کے پچھے والی کھولی میں سے کھڑ خانے کا سامان نکال کر اس میں چلی رات دھنن سے ملاقات کرنے کے لئے ایک چارپائی بچا دی تھی۔ اس کھولی میں صرف ایک چارپائی ہی بچھ سکتی تھی۔ اس گھر میں اور کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ رات کو جب سب سو گئے تو مسزے فیوز دین دھننی باڑھے۔ اپنی بیٹیوں پہنے۔ گئے تین بھائیوں کے بار والے اور سر کے پاؤں میں خوشبو دار تیل لگائے۔ تھکے ہوئے یعنی کھولی میں داخل ہوئے۔ اس نے سر کے ہلے ٹھکانے لگا کر کائے کر دیکھے تھے۔ کھولی میں ایک چھوٹا سا بیل چل رہا تھا۔ زینون نے سر اٹھا کر بلی بار اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ چونکہ صرف شوہر کو دیکھ رہی تھی اور اسے سوائے شوہر کے اور کچھ نہیں چاہتے تھا اس لئے اس نے ایک ہل کے لئے بھی یہ نہ سوجھا کہ اس کے غلام کے چرنے پر چند ایک جمڑیاں ہیں۔ وہ کدور سا اوچر عمر کا ہے۔ اس کے ہونٹ پیچھے اور گھٹنے ہیں اور چلی قطار کے چار دانت بٹاوتی ہیں۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں اور اپنا آپ چوری دیا انداز ہی اور غلوں کے ساتھ اپنے غلام کے ہوائے کر دیا۔

زینون نے ایک شریف اور خدمت شعار بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کر دیا۔ وہ صبح صبح اٹھ جھٹتی۔ وغیرہ کر کے نماز پڑھتی۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتی۔ آٹن چلا کر چائے کے لئے پانی دھوتی۔ پھر سارے گھر میں بھانڈا دھوتی۔ اپنی دونوں بچیوں کو بچاتی۔ ان کے منہ ہاتھ دھانے میں ان کی مدد کرتی۔ ان کے پاؤں میں کھنکھی کرتی۔ پھر غلام کو بچاتی۔ اسے روٹی اور چائے پکا کر دیتی۔ اسے سامنے بیٹھ کر کھلاتی۔ پھر اپنے سر کو چائے دیتی۔ اپنی دونوں سوتیلی لڑکیوں کو ناشتہ کرواتی۔ اپنے غلام کے ذبے میں روٹی اور رات کا سامان گرم کر کے ڈالتی۔ جب وہ درکشاپ چلا جاتا تو خود ناشتہ کرتی۔ سارے برتن مانجھتی لڑکیاں سکول نہیں جاتی تھیں۔ وہ کام کاج

میں اپنی سوتیلی ماں کا ہاتھ بنا تھا۔ وہ میری کو زخموں بازار سے کوئی بھری دیکھو مٹھا کر پکائی۔ دہلی پکا کر بچوں کو اور اپنے بھائی کو کھاتی۔ اس کا سر دھیر کا کھانا کھا کر اپنے بوڑھے مسز کی دکان پر چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ شام کو جب اس کا غلوں درکشاپ سے واپس آتا تو وہ اس کا منہ ہاتھ دھاتی۔ اس کے دھوئے ہوئے کپڑے لایا کرتا ہے۔ وہ اپنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتی۔ جب وہ بستر پر لیٹ جاتا تو اس کے پاؤں دایا شروع کر دیتی۔ وہ اس سے پیار بھری باتیں کرتے تھے۔ جب تک وہ سو نہ جاتا زخموں برابر اسے دایا جاتی۔ میری کو سلا کر وہ خود چھٹی لڑکی کے ساتھ چارپائی پر پر کر رہا جاتی۔

اپنے غلوں کی خدمت کو زخموں نے اپنا ایمان بنایا تھا۔ اس نے مدد کر رکھا تھا کہ وہ غریبوں میں بھی اپنے غلوں کو بھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گی اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھے گی۔ وہ اس کی لڑکیوں سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور انہیں ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیتی تھی کہ وہ ان کی سوتیلی ماں ہے۔ وہ اپنے غلوں کے باپ کا بھی پورا خیال رکھتی تھی۔ وہ اگر کوئی رات کو پانی مانگتے تو زخموں خند سے دیکھ کر دیا کرتی اور خود اپنے کپڑے کو پانی پاتی۔

مسز فیروز دین کی زندگی کا تو نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ تو ایک بالکل ہی نئی دنیا میں آ گیا تھا۔ وہ تو اپنی دینی کا عاشق بن گیا تھا۔ اور میرے جوں ہونے لگا تھا۔ اسے اتنا سکھ زندگی میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اس کا ایک بلی بھی زخموں کے بھیری نہ لگا تھا۔ درکشاپ میں وہ اپنے سارے کارکنوں کے سامنے اپنی دینی ہی کے مہن کا ریتا۔ کارکن اسے مذاق بھی کرتے اس کا سطر بھی اڑاتے مگر وہ ہنس کر تھل دیتا۔ اس کی زندگی میں ایسا بڑھکوار انقلاب آ گیا تھا کہ اس کی کلیا ہی پختہ تھی۔ زخموں نے بھی اپنی بچہ کی زندگی کے سچے عادات کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ اور ایک نیا جسم بنے لیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بیٹھ سے اسی ماحول میں رہ رہی ہے۔ اور وہ زخموں کوئی دوسری عورت تھی جو جگہ جگہ بڑے فروشوں کے ہاتھوں میں کھیتی رہی۔ چھ ماہ بڑی خوشی اور اطمینان سے گزر گئے۔ اس دوران میں زخموں کی کثیر سے بھی کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ اس نے اس کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہ کی۔ کبیر نے ایک اچھا کام کر دیا تھا۔ اب زخموں اچھائی کے اس راستے پر پوری توجہ جمی تھی اور منانے سے گھڑن تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ زخموں ہر اعتبار سے اپنے گھر میں خوش تھی۔ اگر کوئی بھی تھی تو صرف یہ کہ اس کے ہاں بچہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے کئی عورتوں سے مشورہ کیا۔ کئی عورتوں پانی میں گھول کر رکھ۔ آخر وہ اپنے غلوں کے ساتھ ایک دکان پہنچ گئی۔ ڈاکٹری نے اس کا پورا معائنہ کیا اور کہا کہ اس کے اندر خرابی پیدا ہو گئی ہے اور بچے کی امید قریب قریب ناممکن ہے۔ زخموں اس کو گئی۔ ڈاکٹری نے کہا۔

”طعام پر کافی دھیان دینا۔ بھر بھی روپے میں ہے صرف ایک آنے کا سامانی کی توقع ہے۔“

زخموں اپنے غلوں کے ساتھ دل برداشتہ ہو کر واپس گھر آ گئی۔ مسز فیروز دین نے اسے تسلی دی کہ اگر خدا کی مرضی ہوگی تو اس کی گود ضرور ہری ہو جائے گی۔ اس دن سے نماز پڑھ کر روز خدا کے حضور میں بیٹھ کے لئے دعا میں مانگنا شروع کر دیں۔ چھ ماہ اور گزر گئے۔

زخموں نے اپنی سوتیلی لڑکیوں کو ہی اپنی اولاد سمجھ لیا اور ان سے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح محبت کرنے لگی۔ سڑیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک روز زخموں گھر میں چارپائی پر بیٹھی اپنی چھٹی لڑکی کے کرتے ہی رہی تھی کہ ایک اویڑو عورت کی سواری برقعے والی عورت سلام کر کے اندر آ گئی۔ زخموں گھر میں آ گئی تھی۔ اس کی دونوں لڑکیاں اوپر دھوپ میں بیٹھی غلظت سیکھنے کے لئے ان کے تھکے کات کر پاروں میں پرو رہی تھیں۔ غلوں درکشاپ میں گیا ہوا تھا اور سسر اپنے دوست کی دکان پر جا چکا تھا۔

زخموں نے نوادہ عورت کا چہرہ دیکھا تو اسے اپنے برے زمانے کے دیکھے ہوئے چہرے یاد آ گئے۔ وطنی عمر لگن ہونٹوں پر لب تک ماسھے پر کئی ہوئی لٹ۔ کالوں میں سونے کے بندے۔ جہ میں پان۔ آنکھوں میں سرمہ اور جسم پر رہتی سوٹ جس کا گریبان کھلا تھا۔ زخموں نے کہ ایک طرف رکھ دیا اور اسے بیٹھے کو بیڑی دی۔ عورت نے ٹاک چڑھا کر گھر کا جائزہ لیا اور بیڑی پر بیٹھ گئی۔

”آپ کہاں سے آئی ہیں؟“

عورت نے پان ایک کٹے سے دوسرے کٹے میں دباتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نام زخموں ہے؟“

”جی ہاں۔“ فریاد کیا کام ہے آپ کو؟“

بول رہی ہو۔ ایسا — ایسا نہیں ہو سکتا۔

عورت نہیں پڑی۔

”اگر قحط دین چاہتی ہو تو کل ہی دیکھ لیتا۔ کل رات ہونے سے پہلے غلے کے تھارے خانہ کو قتل کر دیں گے اور جسیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ اب ان کے چنگل سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ قریبی صاحب جو کہتے ہیں وہ بات منظور کر لو۔“

”کوئی بات؟“

”جس ہر تیسرے روز دوسرے کو ان کی غنی کو غنی میں جا کر ان کا دل خوش کرنا ہو۔ اگر تم نے یہ شرط منظور کی تو اس کا انجام انتہائی خوفناک ہو گا۔ قریبی صاحب صرف تمہارے خانہ کو ہی قبضہ کی گنجائش دینگے۔ کا قبضہ نہیں بنا دیں گے۔ بلکہ ان غنوں کو بھی اجازت دے دیں گے کہ وہ اپنی زمین بانی کر سکیں اور اس طرح ہزاروں گھریں پیدا نہیں ہو گا۔ بلکہ خانہ بھی بار بار جائیگا۔ اور تم در بدر کی ٹھوکریں کھائی پھاؤ گی۔ میں جسیں صرف یہی کہنے آئی تھی۔ میں جا رہی ہوں۔ اگر یہاں رہی ہوں تو کچھ سے رہنا چاہتی ہو تو کل اس وقت بہن آباد کی کو غنی نہیں۔ میں کچھ ہانا اچھا بیٹا ہوں۔“

”اجی بات کر کے عورت تو پہلی گئی چکن زینوں کے سر پر گویا مکان کی چمت کر پڑی تھی۔ وہ سچی ہی دیر بھوت سی ہو کر بھٹی رہی۔ ایک منٹ پہلے جس گھر میں ہر طرف سرخوں اور خوشیوں کے بخارے بچ رہے تھے۔ اب اس کی ایک ایک دیوار گر رہی تھی اور زینوں کے ارمانوں کا گھاٹھوٹ رہی تھی۔ اوپر سے اس کی پڑی لڑکی نے آواز دی۔“

”اچھی ظلم قسم ہو گئے ہیں۔ بازار سے اور منگوا لیں؟“

”زینوں کو یہ آواز پڑی اپنی گلی۔ جیسے کسی دوسری دنیا ہے آ رہی ہو۔ شام کو اس کا خانہ در کشاپ سے واپس آیا تو وہ اس بچے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی جس کے باپ کا جنازہ اس کی معصوم آنکھوں کے سامنے اٹھایا جا رہا ہو۔ اس نے روز سے زیادہ محبت کے ساتھ اسے روٹی ڈال کر دی۔ نہ ہاتھ دھلایا۔ دھوئی اور قبض اندر سے لا کر دی۔ اس کے ڈبے کو خود صاف کیا۔ اس کی مٹھیاں بھریں۔ اور رات کو اس کے بچے سے لگ کر رو پڑی۔“

عورت بڑھی سے اٹھ کر زینوں کے پاس چائنا کی پرستہ گئی اور ذرا جھک کر بولی۔

”تم اتنی غریب میں آپنی جوانی کھول بیاد کر رہی ہو؟“
زینوں ایک دم پرے بہت گئی۔
”کیا مطلب؟“

عورت نے مسکرا کر کہا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں میں کس چیز کی کمی ہے۔ تم اگر چاہو تو دولت تمہارے قدم قدم سے مل سکتی ہے۔ آخر تم اس انداز سے کوئی بھی کچھ کر رہی ہو؟“
زینوں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔
”آپ کو ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔“

عورت نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں تو مجھے کس نے سمجھا ہے؟“

”کسی نے سمجھا ہو۔ میں آپ سے ایسی باتیں سننے کو چار نہیں ہوں اگر آپ کو بھی باتیں کہنا ہیں تو آپ قریبی لے جائیں۔“
عورت نے بھونپ کر بھی کر لیں۔ اور قریبی ہو کر بولی۔

”تو پھر سنو! میں جانتی ہوں تم کون ہو تم کہاں سے آئی ہو اور کیا کیا کرتی رہی ہو۔ مجھے کارخانہ دار قریبی نے سمجھا ہے۔ وہی قریبی جس کے پاس تم منہ آباد میں شاہد کے گھر ایک رات گزار چکی ہو۔“

زینوں کو گویا تکتا سا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سرو ہو کر سفید پڑ گئے اتنے جیسے نہیں آ رہا تھا کہ اتنی مدت گزر جانے پر اور زندگی اتنی خوشگوار ہو جانے کے بعد بھی کوئی اس کے گھٹن میں آگ لگا سکتا ہے۔ عورت بولنے جا رہی تھی۔

”جن لوگوں سے تم بھاگ کر آئی ہو انہیں تمہارے لٹکانے کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اگر چاہتے تو جسیں یہاں سے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ ایک منٹ کے اندر اندر تمہارے خانہ کو لٹکانے لگ سکتے ہیں اور اس کی لاش کو ایسی جگہ غائب کر سکتے ہیں جہاں سے ہزاروں سال تک کسی کو کھوج نہیں لگ سکتا۔ لیکن کارخانہ دار قریبی صاحب نے انہیں روک رکھا ہے۔ اس لئے کہ وہ غلے ان کے اپنے آدمی ہیں۔“

زینوں پر بھٹی سی گر پڑی تھی۔ انہں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”تم بھوت

ہے اور وہ خلتے واقعی اس کے اپنے آدمی ہیں۔ اس نے تو اب مجھ سے بھی ملنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن جب وہ جاتا ہے تو مجھے جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ غنڈوں کا سرگرم ہے اور ان پر ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ اس نے ہمیں بلایا ہے تو ہمیں جانا ہی پڑے گا۔ تم اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی ہو۔

زہن نے انھیں پوچھ کر کہا۔

میں پولیس کو اطلاع کروں گی۔

اس سے معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ تمہارا خاندان ہمیں فوراً چھوڑ دے گا۔ کوئی شریف خاندان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی کے قانون میں چسپے ہوں اور وہ بھی اس الزام میں کہ اس کی بیوی پیشہ کروایا کرتی تھی۔ میں ہمیں ایک مشورہ دوں گی کہ اگر ہمیں اپنے گمنام کا بیکہ اور گھریلو زندگی کا ماحول عزیز ہے تو بچے سے قہقی کی بات مان دو بات کا پکا آدمی ہے۔ تم اس کے پاس ہفتہ میں ایک آٹھ بار جلی جلاؤ گی تو وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گا اور تمہارا گھر چاہے ہونے سے بچ جائے گا۔

زہن کے کہنے میں جہاں جمل رہی تھیں۔ اسے شاید سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی نہ گھر اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا تھا اور اسے ایسا مشورہ دیا تھا جس پر عمل کرنے سے اس کے خاوند کی زندگی اور اس کا گھریلو سکون ٹھوکر رہتا تھا۔ مگر اس کی اپنی شخصیت کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ زہن کا دلچسپ رہتا تھا اور وہ اچھی اور برقعہ اوڑھ کر شاید کے گھر سے باہر نکل آتی۔

باہر آکر اس نے وہ راستہ پکڑ لیا جو کارخانہ دار قہقی کی کوٹھی کو جاتا تھا۔ وہ یوں چلی جا رہی تھی جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں آکھڑا رہتا ہو گا۔ مگر نہ وہ کبھی زہن کو وہاں نہ جاتا۔ زہن نے کھنٹی بجائی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ اور زہن کو وہاں خانے میں بٹھلا دیا۔ چھوٹی درہندہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا۔ کارخانہ دار ایڈر آگیا اور حق مندی کے ساتھ مسکرا کر زہن کی طرف دیکھنے لگا۔

میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔ تم بڑی سمجھدار عورت ہو۔

زہن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا ہوا زہن؟ خیر تو ہے؟“

زہن نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہاری بہن کی بہن کو دیکھ کر تھک کر بیٹھ گیا۔ میں آپ کے لائق نہ تھی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو زہن! میں تو خوش قسمت آدمی ہوں جو مجھے تم ایسی بیوی مل گئی۔ میرا گھر تو وہاں تھا۔ اسے تم نے تو آباد کیا ہے۔ اس گھر میں اتنی خوشیاں

اور اتنی رونق پہلے کہاں تھی!“

ان باتوں سے زہن کا پی اور بھر آیا۔ اور وہ چٹکیاں لے کر روئے اٹھی۔

”جانتے کس وقت خاوند کے ساتھ لگے روٹے روٹے اسے خیر آگئی صبح وہ اچھی تو

اس کا سر جو جمل ہو رہا تھا۔ اسے یاد آگیا کہ آج وہیر اگر وہ اوٹش کارخانہ دار کے پاس نہ گئی تو اس کی گھریلو زندگی کے سارے ستون ایک ایک کر کے گر پڑیں گے اور

وہ کیس کی نہ رہے گی۔ اس کے باوجود وہ اپنے خاوند کو دھوکہ دینا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند کو خود ہی سب کچھ بتا دے گی۔ لیکن اس کے

اٹھنا کا کام نہیں کالے گی۔ لیکن — وہ لوگ غصے میں تھے۔ اسے ہانک کر دوس کے

زہن کا لپٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جن لوگوں کے چکلے لے وہ ہانک کر اٹھتی تھی۔ وہ

کتنے بے رحم اور سنگدل لوگ ہیں اور وہ کیا نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے کسی کو موت

کے گھاٹ اتار دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اچانک اسے اپنی سبیلی شاید کا خیال آ

آگیا۔ اسے شاید سے خاموش فریاد گئی تھا۔ کارخانہ دار اس کا دوست ہے۔ اسے

شاید سے جا کر مشورہ کرنا چاہیے۔ کہ وہ کارخانہ دار سے اس کی سفارش کرے اور

اس کے پر سکون گھر کو چاہے ہونے سے بچائے۔

زہن نے برقعہ اوڑھا اور ہسپتال تک جانے کا ہمان بنا کر گھر سے نکلی اور بس

میں سوار ہو سیدھی سمن آباد آگئی۔ وہ شاید سے جانتی ہی پٹ گئی اور اپنے اعتبار

دہننے لگی۔ شاید حیران ہو کر رہ گئی۔ اسے اتنا مطمئن نہ چکا تھا کہ زہن نے شاید سے

بی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔ وہ کبھی شاید اس کے خاوند

نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ جب زہن نے سوئے ہوئے اسے پوری بات سنائی تو

شاید سے سوچ میں پڑ گئی۔ زہن نے گڑگڑا کر شاید سے التجا کی کہ وہ اس کی گھریلو زندگی

کو نہجاری کے بار سے بچائے۔ شاید نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

”مجھے الموس ہے زہن میں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ قہقی بڑا ذلیل آدمی

”کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟ کیا تم میری زندگی پر حس نہیں کھا سکتے؟ میں تمہارے پاؤں پر پڑتی ہوں۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان فراموش نہیں کروں گی۔“

کارخانے دار نے یہ فقرہ لگایا اور زخموں کی گردن پر ہاتھ بھر کر بولا۔

”مجھ پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہو گا۔ میں تمہارے جسم کا عاشق ہوں اور جس چیز پر میں عاشق ہوتا ہوں۔ اسے حاصل کر کے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے میری خواہش کے مطابق عمل نہ کیا تو اس کے انتہام سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اس پر قہر امارہ دو اور میرے ساتھ ساتھ دانے کمرے میں آہلا۔ وہاں ہسٹری شراپ اور گرم ہسٹری جہاد اہتمام کر رہا ہے۔“

زخموں کا سر جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے چوہہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ کارخانہ دار اب اس کے ساتھ دانے کمرے میں چلا گیا۔

”میں صرف پانچ منٹ تمہارا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد یہاں وہ لوگ پہنچ جائیں گے۔ جن سے تمہارے ایک رات تم کمرے سے نکل گئی تھی۔ اور یاد رکھو اب تم ان کے پہنچنے سے ساری عمر محبت حاصل نہ کر سکو گی۔ اگر میرے ہنگام پر آجایا کرو گی تو کسی کو کالوں کا خبر نہ ہو گی تمہارا گھر بھی محفوظ رہے گا اور جس بھی کوئی مجھ نہ کہے گا۔ میں ساتھ دانے کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

زخموں دواخانے میں بیٹھی روتی تھی۔ وہاں اسے قتل دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے سوائے کارخانہ دار کی خواہش کو جاننے کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پرانی ہولناک زندگی کی بدولت میں وہ گرتا نہیں تھا حتیٰ اور ہی شرط زندگی کی پر سکون دواخانے کو وہ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے اچانک دل میں ایک فیصلہ کیا۔ گردن اور اٹھا کر کمرے میں چادروں طرف دیکھا۔ یہ قہر امارہ۔ وہ پتہ اور قبضہ امارہ کر مومنے پر زندگی اور کارخانے دار کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔

بچنے میں وہ دن پوری باقاعدگی سے زخموں کو کارخانہ دار کی گنجی میں اپنے گھر کی لاج بچانے کے لئے اپنی لاج لٹائے آتا رہتا۔ اس نے غلو کو یہ کہہ دیا کہ وہ ہسپتال میں بچنے کے علاج کے سلسلے میں جاتی ہے غلو اس پر بھی شک کر رہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مکے والے بھی ایسے حالات میں جین سے نہیں بیٹھا کرتے۔ وہ پہلے ہی حیران تھے کہ بوڑھے مسز نے جو ان لڑکی سے شادی رکھائی ہے۔ پھر کوئی شوش کیوں

نہیں چھننا۔ یہ لڑکی اتنی شریف کیسے ہو سکتی ہے کہ بوڑھے غلو کے ساتھ ننگ کر ساری جوانی برباد کرے۔ چنانچہ جب زخموں بچنے میں دوبار بڑی باقاعدگی کے ساتھ گھر سے نکلے گی تو مکے کے چٹلے زخموں نے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایسی باتیں بھی چھپی نہیں رہا کرتی۔ سچ کل کے زمانے میں تو کسی کی نیکی بھی نہیں چھپی اور نہ ہی تو کسی زمانے میں بھی چھپ نہیں سکی۔ مکے والوں کو معلوم ہو گیا کہ ہسٹری فیوژ دین کی جوان بیوی غلو سے چھپ کر قریبی کارخانے دار سے ملنے اس کی کوٹھی جاتی ہے جو ایک ادبش آدمی ہے اور چوہیں مکے شراپ کے لئے میں رہتا ہے۔ مکے میں گھر گھر یہی شروع ہو گئی۔ عورتوں نے مسز فیوژ دین کی بیٹوں کے چاچا اور کاکا کے ساتھ شروع کر دیئے۔ اور مردوں نے مسز فیوژ دین کا خسر اڑانا اور اس پر کواڑے کئے شروع کر دیئے۔

زخموں کو ان باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ اپنی شریف بن چکی تھی کہ گھر کے مکے چھینے اور اپنے غلو کی زندگی گزارنے کے لئے وہ اس دن کاری کو بھی ایک اڑدہائی فرض سمجھ کر پوری طرح ادا کر رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک انتہائی مذہب منہ حرکت کر رہی ہے۔ اور آگ سے بھیل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے غلو اور اپنے گھر کی محبت میں پاگل ہی ہو کر یہ کام کر رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکے کے کچھ لوگوں نے ایک روز مسز فیوژ دین کو چاکر بھلا کر وہ کیڑی طرح آنکھیں بند کر کے کیوں پڑا ہے جب کہ اس کے گھر میں اس کی عزت و آبرو لٹ رہی ہے۔ مسز کو یقین نہ آیا۔ لیکن جب اس کی بیٹوں نے بھی اسے یقین دہانی کی تو حیران اور پریشان ہو کر رہ گیا۔ بیٹوں نے کہا۔

”اس حرامزادی کو فوراً حلاق اسے دو۔ ہم ایسی گجری کو ایک منٹ بھی گھر میں نہیں رکھ سکتے۔“

مسز نے بھول پنے سے کہا۔

”لیکن کوئی ثبوت بھی تو ہو۔“

چنانچہ یہ وقت مسز کی بیٹوں نے زخموں کو بتائے بغیر اوز اس سے لڑے۔ جیسے بغیر یہ پروگرام بنایا کہ ایک روز اس کا بچپا کیا جائے۔ ایک روز جب زخموں حسب وعدہ اپنے گھر سے باہر نکلے تو پیچھے پیچھے مسز کی دونوں دواخانے میں اپنے بھائی

گھر والوں اور محلے والوں پر احمق نہیں تھا۔ یہ قوفوں کے گھروں کو پیش دنیا دار لوگوں نے چاہ کیا ہے۔

اور آیا ہی ہوا۔ "نہن کا گھڑاڑ کیا۔ اس کی زندگی دیران ہو گئی۔ سمندر کی تلاش میں غلٹی ہوئی صحرائی سر ایک بار پھر صحرائوں کی رست میں جذب ہو کر رہ گئی۔ فیوز دین کی سادگی نے اس کا اڑا ہوا گھر آباد کیا اور اسی سادگی نے اس کے گھر کے سکون کی انتہا سے لذت بھاری۔ وہ مسزئی سے ملا تو اس نے دیکھا کہ وہ دونوں میں بوجھا ہوا گیا ہے۔ اس کا چہرہ جھروں سے لگ گیا ہے۔ آنکھوں میں ناقابل بیان اذیت اور کرب جھانک رہا ہے۔ چہرے پر مروتی چھائی ہوئی ہے۔ جسم جھک گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی مرد ہے جو قبر سے تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل آیا ہے۔ اس نے کبیر سے کوئی بات نہ کی۔ صرف پہلی پہلی نگاہوں سے دیکھ رہا اور پھر سر جھکا کر کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کبیر بچکے نے ورکشاپ سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد نہ تو وہ مسزئی فیوز دین سے کبھی ملا اور نہ اس نے نہن ہی کو پھر نہیں دیکھا۔ کوئی چھ ماہ بعد اسے خبر ملی کہ مسزئی فیوز دین کا انتقال ہو گیا ہے۔ کبیر کو اس کا دکھ ہوا۔ لیکن اس نے سوچا کہ موت ہی اس پر نصیب محض کے دکھوں کا علاج تھی۔ اپنے انسان کو ہمارے انصاف دشمن معاشرے میں صرف موت ہی اپنی گود میں پناہ دے سکتی ہے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ایک سال، دو سال تین سال گزر گئے۔ لوگ مسزئی فیوز دین "آن کے ایلے اور نہن کو بھول گئے۔ ویسے یہ لوگ نہانے کو پہلے بھی کیا یاد تھے کبیر اپنی پرانی فکر پر چلتے ہوئے زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ قرض لے کر ایک قرض اٹارتا اور اسے اتارنے کے لئے پھر کہیں ایسے قرض پکڑ لیتا۔ اس کی

ساری زندگی کسی سے مانگا ہوا قرض تھی جسے وہ مرتے دم تک اتارنے کا عہد کیے ہوئے تھا۔ وہ رباب ایئر قسری کے ساتھ بیٹھ کر بیٹھنے ایئر کے دفتر میں بیٹھ اڑاتا۔ اس کے جھگڑے دیکھ کر ان کی گالیاں سنسنی انگیزاں دیتا اور زندگی کی گاڑی کو دھکے دے کر چلائے چلے جاتا۔ ایک روز وہ بیٹھنے ایئر کے دفتر کے قلمی اخبار کے دفتر میں داخل ہوا تو اسے بند کمرے کے پیچھے سے عورتوں کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں کبھی کوئی پردہ دار شریف عورت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ کبیر نے دندازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر رباب امر قسری اور بیٹھسا ایئر تین عورتوں کے ساتھ مل

بٹنی فیوز دین مسزئی کو ساتھ لے کر چل پڑیں۔ مسزئی یوں ساتھ جا رہا تھا جیسے وہ ورکشاپ کام پر جا رہا ہو۔ صرف کبھی کبھی وہ سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر دل ہی دل میں ہنسنے لگتا۔

"نہن! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

انہوں نے دیکھا کہ نہن کا رخ دار کی کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ وہ دونوں بہنوں اور مسزئی نے کچھ دیر کوٹھی کے باہر ایک طرف انتظار کیا حتیٰ کہ نہن کے بعد گالیاں دیتی رہیں اور کالوں کو بار بار ہاتھ لگاتی رہیں۔ کوئی چندہ میں منت کے بعد دونوں چلا آگئیں اور تین اپنے یہ وقت بھائی کو ساتھ لے کر کوٹھی کے اندر نہانے سے داخل ہو گئیں۔ انہوں نے وہاں غاسے کا دواؤں چھٹ کھول دیا۔ اندر کا نظریہ تھا کہ نہن آنکھیں بند کئے کارخانے دار قسری کی گود میں چڑی تھی اور وہ صوفے پر دراز اس کے شکم پہ بیٹھ رہا تھا۔

بہنوں نے اندر جاتے ہی سیٹا شروع کر دیا۔ اور نہن کو گالیاں اور بددعائیں دینا شروع کر دیں۔ نہن کے غائب ہونے پر مسزئی فیوز دین کو جیسے پیٹھ پر بیکہ وہ تو پھر کا بت بنا اسے دیکھنے کا دیکھنا ہی وہ گیا۔ کارخانے دار چڑا پٹے کے لئے میں قہر بھی وہ کچھ گیا کہ نہن کے گھر والے آ گئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنی جگہ پر مضبوط تھا۔ اس لئے غاموش بیٹھا رہا۔ نہن کا سارا جسم سرخ پڑ گیا۔ رنگ زرد ہو گیا اور اس نے اپنے غائبہ کو دیکھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گئی۔ دونوں بہنیں روٹی روٹی گالیاں دیتی اپنے راضی بھائی کو نصیحت کر باہر نکل گئیں اور یہ کہہ گئیں۔

"اب اسی دار کے پاس نہن بیٹھتے تھے آج ہی طلاق یہاں ہو چکے ہیں۔"

اور اسی روز کارخانہ دار کی کوٹھی میں نہن کو طلاق نامہ مل گیا۔ نہن بھڑکی میں آ چکی تھی۔ اس نے طلاق نامہ دیکھ کر ایک قح مارا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

.....

ایک بیٹے کے بعد کبیر کو اس حادثہ جانکاو کا غم ہوا تو اسے بہت القوس ہوا۔ ویسے وہ جان تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ اسے مسزئی فیوز دین کی یہ بے وقوفی کی انمول اچھائی اور خدائی نعمت پر پورا بخیر نہ تھا۔ لیکن اسے اس کے

کر بیڑا لیا رہے تھے۔ ایڈیٹر اور دیباہ امیر تری نے ایک نغمہ مستند سے اس کا خیر مقدم کیا۔ عورتوں نے بھی مسکرا کر لٹلی آنکھوں سے کبیر کو دیکھا۔ اچانک کبیر گھاس میں اپنے لئے بیڑا اڑھتے ہوئے رک گیا۔ اس نے بیڑا کی بوتل داہیں میز پر رکھ دی اور ایک عورت کی طرف دیکھا رو گیا۔

یہ عورت وہ عورتوں کے درمیان میں بیٹھی تھی۔ اور بیڑا کا گھاس اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سرسے ہاتھ کی انگلیوں میں بیڑی غلاست سے پکڑا ہوا سگریٹ سبک رہا تھا۔ وہ عورت بھی کبیر کو مسلسل دیکھ رہی تھی اور اس کا ایک ہاتھ پہلے مسکراتا چہرہ مسکرا کر منٹ سا گیا تھا۔ کبیر نے اسے پہچان لیا۔ وہ آہستہ سے اس کی طرف جھکا اور بولا۔

”نہن! ساتھ والے کمرے میں میری ایک ہاتھ سونکی؟“

نہن نے ذرا سا مسکرا کر گھاس میز پر رکھ دیا۔ سگریٹ کا ٹکڑا جھاڑا اپنی پینسی ہوئی بیٹ جیت رہی تھیں کے بل و دست کرتی اٹھی اور کبیر کیساتھ دوسرے کمرے میں آگئی۔ اس کے پیچھے دیباہ امیر تری اور بیٹے ایڈیٹر نے شور مچا کر شروع کر دیا۔

”کیسے آتے ہی عورت پر حملہ کر دیا۔“ لے گیا سارا میری جھوٹ کو سنے پاس میری بھراں۔۔۔“

دوسرے کمرے میں داخل ہو کر کبیر نے دروازہ بند کر لیا۔ نہن اس جگہ سانسے تھیں کپڑوں میں لمبوس شراب کے سروں میں پٹکے پٹکے مجسم سی رہی تھی۔ یہ وہ نہن تھیں تھیں پٹکے اس کا ڈھانچہ تھا۔ اس میں سے نہن کو جھانک کر پڑا تھا۔ وہ بڑی دلی ہنس رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد کمرے حلقہ نہ گئے تھے۔ چہرہ لیوڑا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابڑھ آئی تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب قسم کی مہلت سی چھا گئی تھی۔ رخساروں پر چھائیاں سی پڑ گئی تھیں۔ لیکن وہ بہتر لہاس پنے ہوئے تھے اور اس نے برقی پاؤں بڑی طرح تھوپ رکھا تھا۔ کبیر نے کہا۔

”نہن! تمہیں کیا ہو گیا؟“

نہن نے سگریٹ کا ٹکڑا لگایا اور ذرا سا مسکرا کر بولی۔

”اول تو میرا نام نہن نہیں بھراں ہے۔ نہن ایک عرصہ ہوا مر چکی ہے۔ میں نے سن آبا سے خود اس کا جنازہ اٹھا دیکھا ہے۔ بھراں زندہ ہے اور جب زندہ

ہے پوری طرح زندہ رہے گی۔ نہن مر چکی ہے اور بیٹ کے لئے مر چکی ہے۔ کوئی اور بات؟“

”کوئی نہیں۔“

نہن نے بڑی شان سے نیازی سے سگریٹ کا ٹکڑا لگایا اور مسکراتی ہوئی نئے میں کچھ جھوٹی ہوئی باہر نکل گئی۔ کبیر کچھ دیر اکیلا کمرے میں کھڑا فرش کو ٹھکا رہا۔ پھر وہ بھی باہر نکل گیا۔ ایڈیٹر کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے نہن کے قہقہے کی آواز سنی اور زندگی میں شاید پہلی بار کبیر کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے۔ اس نے اچھی دودھ بھری پیچ پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ وہ چپکے سے دفتر سے باہر آ گیا۔ باہر سیکڑا دروازے کی رات شور سے بھر پور تھی۔ لیکن کبیر کو یوں محسوس ہوا جیسے سارا شہر سناں ہو گیا ہے۔ ساری رات دیران ہو گئی ہے۔ اور اس ہولناک ٹٹائے میں سوائے ایک دلدادہ قہقہے کے ایک دھماکا جھج کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ وہ سر جھکائے ایڈیٹر دروازے کی طرف چل پڑا۔ شل پہاڑی کی طرف چمکیں سو گوار۔ جٹا چاند طلوع ہو رہا تھا۔